نادیہ ارمین

طلوعِ عشق

آفس کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ تبھی اپنا چوکیدار کافی مستعد تھا۔ ہاتھ میں پکڑی قدرے بھاری فائل کو میز پر رکھ کر وہ کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی کے پٹ کھول کر وہ واپس میز کی طرف آیا۔ بیٹھنے سے پہلے غیر ارادی طور پر اس نے ٹیبل کے لیفٹ سائیڈ پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر چیک کیا تھا۔ ٹون جاری تھی۔ فون رکھ کر وہ اپنے سامنے پڑی فائل اٹھا کر اس پر سرسری نگاہ ڈالنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ٹیبل پر رکھ کر چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگا۔

آج مسز کریم کے کیس کی آخری تاریخ تھی اسے یقین تھا کہ آج اس کیس کا فیصلہ بہت بہتر اور اچھا ہو گا۔ اسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔ کیس عام نوعیت کا تھا۔ میاں بیوی کی چپقلش اور طلاق کا مسئلہ۔ ایسے کئی کیسز وہ جیت چکا تھا۔ وکالت کے پیشے سے باقاعدہ منسلک ہوئے اسے تین سال ہی ہوئے تھے۔ اس کے والد علاقے کے ایک نامی گرامی وکیل تھے۔ ایک شہرت یافتہ وکیل کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے بھی اسے خاصی اہمیت حاصل تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی اسے خیالات کی دنیا سے کھینچ نکال لائی تھی۔

"ہیلو حسن سے بات ہو سکتی ہے۔" اس کی دھیمی آواز اس کے کانوں میں رس گھول چکی تھی۔

"آپ کیا ہے فون میں صبح سے انتظار کر رہا تھا۔ تم یار کبھی کبھی تم حد سے زیادہ سیلفش ہو جاتی ہو۔ مجھے بھی فون کرنے سے منع کرتی ہو اور خود بھی کئی کئی دن تک غائب رہتی ہو۔ واٹ نان سینس یار۔" وہ پچھلے تین دن سے اس کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس قدر طویل انتظار نے اسے اچھا خاصا بد مزہ کر دیا تھا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ کیا تم کریم مل ریسٹورنٹ آ سکتے ہو؟" اس کے جلے کٹے لہجے اور شگفتہ انداز کے جواب میں وہ اتنی ہی سنجیدگی سے بولی تھی۔ اس کے حد سے زیادہ سنجیدہ لہجے نے اسے بھی سنجیدہ کر دیا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں ضروری بات ہے۔ ٹھیک سوا دو بجے" اس نے دوہرا کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں ایک سوا دو بجے تک آ رہا ہوں۔" اس کی بات کے جواب میں اس نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

ٹھیک دو بجے وہ آفس سے نکلا تھا اور سوا دو بجے وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت لوگوں کی تعداد کافی کم تھی۔ وہ اسے ایک کونے والی ٹیبل کے پاس بیٹھی نظر آئی تو وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔ قریب جا کر سلام کر کے وہ چیئر کھسکا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا موڈ ہرگز خوشگوار نہیں تھا ورنہ وہ ہمیشہ شگفتہ تر و تازہ ہشاش بشاش دکھائی دینے والی تھی۔

"آج میری چچی کراچی آ رہی ہیں۔ رشتے کی بات کرنے میں تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تمہارا کیا خیال

ہے۔ کیا میں یہاں کہہ دوں۔" اس کے الفاظ میں اسے عجیب سی کاٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ چبھن جو بہت تکلیف دے رہی تھی۔ بات مکمل کر کے وہ پھر سے کہنے لگی تھی۔

"تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو یا تم حقیقتاً؟" اس نے کہا۔ "اب وہ کیا ہوا ہے اپنا فیصلہ اپنی مرضی نہیں سنا سکتے۔ تم جانتے ہو کیونکہ اس کا علم مجھے نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تمہاری ذرا سی کمزوری ہم دونوں کی جدائی کا باعث بنے گی۔ میں یہاں فقرہ نہیں کروں گی۔ اس نے کہا تھا کہ میں حقیقتاً تم سے محبت کرتی ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر شدید غصہ بھی آتا ہے کہ آخر مجھے ضرورت ہی کیا تھی کہ میں میرا کے ساتھ ایک رانگ کال پر تم سے بات کرنے لگی۔ اچھا تھا یہی سے مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اور ہمارے بیچ طبقاتی فرق ہے اور جانے کیوں مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے والدین نہیں مانیں گے کبھی بھی نہیں۔"

اس نے نظریں جھکا کر بہت دکھ بھری آواز میں کہا تھا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی برقرار رکھنے کے بعد وہ ایک بار پھر بولنے لگی۔

"تم یہ کیا بات کر رہی ہو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟ تمہیں نہیں معلوم۔" اس کی آواز چھلکنے لگی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر وہاں ایک سکوت سا چھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اسے روتے دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے بغیر میں خوش رہ پاؤں گا۔" کچھ دیر بعد اسے اس کی گمبیر آواز سنائی دی۔

"اس تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے بغیر میں تمہیں تنہا یا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ میں نے تمہارے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا ہے محبت کی ہے۔ محبت لباس نہیں ہے کہ جسے بدل دیا جائے۔ محبت دل کرتا ہے۔ اور دل کبھی بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اگر انسان کا اختیار ہوتا ہے تو عجیب بات۔"

اس کے یہی الفاظ اس کے یہی جملے اس کا حوصلہ بڑھا دیتے تھے۔ اس کے اضطراب کو ختم کر دیتے تھے۔ الفاظ سے ہی تو پیاریاں پھیلتی ہیں۔ الفاظ سے ہی تو گھر اجڑتے ہیں۔ الفاظ سے ہی تو خون ہوتے ہیں۔ الفاظ سے ہی تو جنت و دوزخ ہوتی ہے۔ ان لفظوں کے آگے مخلوق کتنا لاچار ہے۔ اس کے وہ بھی الفاظ پر مطمئن و شاداں ہو گئی تھی۔

لفظوں ہی نے انہیں بے پناہ تکلیف دی تھی وہ یہ نہیں جانتے تھے۔

"میں آج ہی بابا سے بات کروں گا۔ اور تمہیں اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں ہوں نا۔ تمہارے اور تمہارے بیچ کوئی نہیں آنے لگے میرا وعدہ ہے۔" اس وعدہ کرنے والا ابھی تقدیر کے کھیلے کو جانتا نہیں تھا۔ سو شاید وہ بھی اس کھیل کو ابھی نہیں بھی جانتے تھے۔ اطمینان والے اس کے ساتھ دیر بعد اس کا موڈ خوشگوار ہوا تھا۔ اسے مطمئن دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گیا۔ پھر کمی آنسو روٹے کر دونوں ہی ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے۔

اس کی کزن چند روز سے ان کے ہاں آئی تھی۔ وہ ایک آزاد خیال اور جرأت مند لڑکی تھی۔ ایک دن اس نے ایک رانگ کال ملائی۔ وہ بھی اس کے قریب بیٹھی تھی۔ کچھ دیر تک تو کزن کو تقیہ ہی سوجھی۔ پھر نمبر ملا کر کال لگائی لوگوں کو بے وقوف بنایا۔ آخر میں اس نے جس جگہ فون ملایا تھا وہاں سے ایک نہایت خوب صورت گمبیر مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

"جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" وہ ابھی ابھی کمپیوٹر پر کیس فائل پڑھ رہا تھا اس کے قریب پڑے سیل فون کی گھنٹی پر اس نے فون ریسیو کیا۔

"آپ سے۔" دوسری طرف جو کوئی بھی تھی اس کی آواز اس کا لہجہ بہت شاندار لگا تھا۔

"جی کہیے۔" کچھ دیر سے انگلیاں چلاتے ہوئے وہ کچھ ریلیکس ہو کر کرسی سے پشت لگا چکا تھا۔

"کہنا تو آپ کو ہے مجھے تو صرف سننا ہے۔" وہ کھلکھلائی تھی۔

"ٹھیک ہے کہہ رہا ہوں آپ کو۔" دوسری طرف سے یکدم فون رکھ دیا گیا تھا۔ وہ ریسیور رکھ کر پھر سے

کی وہ دیر انگلیاں رکھے ہوئے ہوا ہم کرنے لگا تھا اس طرح کے رانگ کالز پر لڑکی کو کرنے والی لڑکیاں اسے ہمیشہ سے بری لگتی تھیں۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے اس جواب کے بعد ہی اس نے فون رکھ دیا تھا کیونکہ کسی کیس میں اس کا بہت کامیاب رہا تھا جبکہ دوسری طرف تو یہ کا جو حقیقت سے سرخ ہو چکا تھا۔ کئی پل تک تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس کی اڑی رنگت دیکھ کر اس نے فکر مندی سے یکدم سے سوال کیا تھا۔

"تھا کوئی بدتمیز تو اتو ہو تم ایک کال ضائع کر دی۔" کچھ دیر بعد اس کی جان میں جان آئی تھی۔

"کیا کہا اس نے کیا کہا۔" وہ حیرت آمیز لہجے میں کہتی اسے سب بتانے پر اکسانے لگی۔ شرمندگی سے اس نے سب بتا دیا۔ وہ اس پر بے تحاشا ہنسنے لگی تھی۔

"آپ کر دو تو بہت تیکھا۔ اور کوئی بات نہیں کی۔" وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

اگلے دن اس کے جانے کے بعد وہ آفس سے آکر کپڑے چینج کرتے ہی سو گئی تھی۔ اسے ملازمت کرتے دو مہینے ہی ہو گئے تھے لیکن اسے کے بعد اس نے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ جاب کی تھی۔ پھر وہاں کی پرنسپل کی سفارش پر اسے ایک پرائیویٹ ادارے میں آپریٹر کی جاب ملی تھی۔ یہ سب کچھ ان کی رشتہ دار کی ان کی ماں جو بے حد مخلص تھیں کی وجہ سے۔ اس کی تنخواہ کافی اچھی تھی۔ کچھ گھنٹے کی ڈیوٹی سے طبیعت کافی بہتر محسوس ہوتی تھی۔ اس کی دو بہنیں تھیں چھوٹے پیٹ وہ بڑی ہوئی اور پھر بھانجی ربی تھی۔ شام کو اسے اس کی ماں نے بیدار کیا تھا۔ گھر آ کر اسے اس کے چائے کے لیے کہا تھا۔ گھر کا کچن اسے شام کی بہن پڑوس میں خوشی کے لیے اس وقت چلا گئی تھی۔ بھائی باہر کھیلنے کے لیے نکلے ہوئے تھے بھائی بہنیں ہاتھ منہ دھو کر سب ہی بھائی پڑھنے بیٹھ گئے تھے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر جانے لگی تھی۔ وہ اسے چائے لانے کا کہہ کر

خود منہ ہاتھ دھونے ہاتھ روم گھس گئی۔ وہ ہاتھ روم سے نکلی تو سموسے لیے حاضر تھی۔

"آپی آج مجھے اسکول کا بیڈ گرل بنا دیا گیا ہے۔" وہ کپ لے کر خوشی خوشی بتانے لگی تھی۔ "بہت اچھا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" اس نے حقیقتاً مسکرا کر کہا تھا اور حقیقت تھی بھی یہ اس کے سب بہن بھائیوں میں وہ بہت ذہین تھی۔ وہ ہمیشہ فرسٹ آتی رہی تھی پورے اسکول میں ٹاپ کرنے والی وہ اسکول کے ہر فنکشن میں نمایاں رہتی تھی۔ وہ اس کو حقیقتاً فخر کرتی تھی اسے خوشخبری سنا کر اٹھا کے چلی گئی وہاں سے کیا ہی کی تھی جبکہ وہ باہر صحن میں رکھی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔ آج پھر کرچی سی محسوس ہو رہی تھی کچھ جس سا ہو رہا تھا اور کچھ لمحوں پہلے خیال آیا تو اس کے دل سے بے اختیار ادا کرنے والا۔ جانے وہ کیا فون کی بیل پر بیٹھی ہوگی اٹھ کر کمرے میں رکھے فون اسٹینڈ کے پاس گئی۔ جہاں حسب معمول فون تھا۔ وہ اپنی بہن کی طبیعت کا پوچھ رہی تھی۔ پچھلے دنوں سے ان کی ماں کی طبیعت خراب رہی تھی۔ ایک چکر وہ لگا چکی

زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کہیں آپ بیتیاں جگ بیتیاں ... سچی داستانوں پر مشتمل

عمران ڈائجسٹ

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے۔

آپ بھی اپنی زندگی سے متعلق کوئی سچا واقعہ کہانی لکھ کر ہمیں بھیجیں ہم اس کی نوک پلک سنوار کر اسے عمران ڈائجسٹ کی سچی داستانوں کی زینت بنائیں گے۔

انچارج شعبہ "سچی داستانیں"

ماہنامہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

تھیں اب یکدم ان سے بھاگ کے فون کر کے ان کی خیریت پوچھتی رہتی تھیں۔ وہ فون رکھ کر باہر کے سٹوں کے ساتھ لیٹ گئی اور سوچنے لگی۔ سوچیں ادھر ادھر بھٹکتی اور آرزو پر ٹھہر گئیں۔ وہ اس کی کال والی بات کو یاد کر کے بے ساختہ ہنسنے لگی۔ پھر جانے کیا ہوا، دل میں کچھ شرارت جاگی۔ ایک تو وہ شخص بھی کو تنگ کرنے کی اور پھر ایک ایسی شخصیت جو بہت دلچسپ ہو۔ جانے کیوں اس خیال پر قدم خود بخود فون سٹینڈ کی طرف بڑھے۔ اس کے لیے بات کرنی بھی تھی۔ پاپا آفس کے ساتھ مل کر اس نے لوگوں کو کال سے روک دیا تھا انہیں تنگ کیا تھا۔ فون سیٹ اٹھا کر اس نے نمبر کو ذہن میں دہراتے ہوئے ڈائل کیا۔

کچھ دیر تک بیل بجتی رہی۔ پھر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" وہ کوئی [illegible] اسی وقت نیند میں تھا۔ اس کی نیند میں ڈوبی آواز سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"جی کس سے بات کرنی ہے؟" دوسری طرف شائستگی سے پوچھا گیا۔

"[illegible] آپ سے ہی۔" اس کے سوالیہ انداز پر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولنے لگی۔

"نہیں کیا مطلب؟"

"میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے قدرے اپنائیت سے کہا جیسے اسے اچھی طرح جانتی ہو۔

"لیکن میں نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے ترش ہو کر جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں کرنا چاہتی ہوں نا۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"تو ٹھیک ہے میں کر رہا ہوں۔" [illegible] یکدم سے اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے پتہ ہے کہ آپ کیا کہنے والے ہیں یہی نا آئی لو یو۔" اس کی بات پر دوسری طرف کچھ دیر سناٹا سا چھا گیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سکون کو اس نے [illegible] ہوئے کہا۔

"تم کے جانتی نہیں کہ میں کس کے ساتھ ہوں۔"

"یہ تم کیا الفاظ کل آپ نے میری کال سے کہے تھے" جانے کیوں اس نے چالاکی دکھائی۔

"آپ [illegible]" کی آواز اچھی تھی۔ وہ متاثر ہو اس کی آواز سے [illegible] کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

"آپ بور ہو رہی تھیں نا۔" آواز میں الفاظ میں طنز نہیں تھا پر جانے کیوں اسے محسوس ہوا۔

"نہیں۔" اس نے بے ساختہ انداز میں باقاعدہ [illegible] میں جواب دیتے ہوئے جواب دیا۔ گویا وہ [illegible]

"آپ [illegible]" اس کے سوال پر کچھ لمحے کے لیے وہ کچھ بول نہیں پائی تھی۔

"بس یونہی تجسس تھا۔"

"آپ اجنبی مردوں سے بات کرتی ہیں تجسس ہوں اچھی بات ہے۔" آپ کی [illegible] اس کے الفاظ میں سخت چبھن تھی [illegible] شدت سے اس نے محسوس کیا۔ یکدم سے اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا کہ آواز سے ضرورت ہی کیا تھی فون کرنے کی۔ [illegible] وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ دل پر ایک بوجھ سا آ گرا تھا اس نے اپنے [illegible] ایک [illegible] آواز [illegible] کس قسم کی لڑکی سمجھا ہو گا ایسا سوچنے والی وہ عورت بھول رہی تھی کہ بے شک وہ آواز تھی۔ [illegible] کی حرکت ایک [illegible] اور تھی تھی۔ [illegible] اس کو اس بات کی [illegible] ہو جائے کہ اس کے [illegible] ہونے والا ہے [illegible] تو وہ [illegible] کرے۔ اس عورت کو اپنے کردار کی [illegible] اپنے اک غلط عمل کی [illegible] ہے۔

"وہ اب غلط لڑکی سمجھے گا" ساری رات وہ کروٹیں بدلتے سوچتی رہی۔ رات گزر گئی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسے صاف صاف بات بتا کر اس کی غلط فہمی کو دور کر دے گی کہ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ اس نے تو صرف تجسس کے ہاتھوں فون کیا تھا اور یہ کہ آئندہ وہ [illegible]

فون کرنے والی ہرگز نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ سو جائے۔ لیکن تقدیر ایسی ہی بے خبری میں رقم ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آخری بار نہیں اسے بار بار فون کرنے کی عادی ہو جائے گی کہ وہ اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو جائے گی۔ بے شک انسان اپنے کل سے ناواقف ہے۔

○ ○ ○

دوسرے دن وہ دفتر سے تقریباً پانچ بجے وہ چپکے سے گھر آنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ گھر کے کسی کی لائٹ جل رہی تھی۔ اس وقت ہوٹل سے واپسی پر ہنسنے کا رواج تھا۔ لیکن فون سیٹ اٹھا کر وہ دوسری جانب سے کچن کے ساتھ ملحقہ اسٹور میں گئی تھی۔ اسٹور کے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے وہ اس کے پاس آ کر لائٹ روشن کر چکی تھی۔ اندھیرے سے دروازہ بند کر کے اس نے نمبر ملایا تھا۔ اس کی آواز سنی تو فوراً بول گئی۔

"مجھے جلدی سے بات کرنی ہے۔ اس لیے وہاں سے خاموشی سے میری بات سنو۔" اس کی بات پر وہ بڑا حیران ہوا تھا۔ تو وہ جان ہی گیا تھا کہ یہ کل والی لڑکی ہے۔

"میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ وہ تو تجسس کے ہاتھوں فون کر ڈالا۔ اب آئندہ نہیں کرنے والی۔ کسی قسم کی اوٹ پٹانگ حرکت میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنی بری ہرگز نہیں ہوں کہ ایرے غیروں کو فون کرتی پھروں۔" وہ سانس لینے کو رکی تو وہ بے اختیار ہنس ڈالا تھا۔

"تو کتنی بری ہو؟" اس کا لہجہ شرارتی لگا تھا۔ وہ متعجب سی ہو کر فون کو گھورتے رہنے کے بعد بولی تھی۔

"مجھے یہی کہنا تھا بس۔" اس کے فون رکھنے سے پہلے وہ بول پڑا تھا۔

"آپ کا نمبر کیا ہے؟" اس نے نمبر پوچھا تھا۔ وہ حیران و پریشان ہو گئی۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" پریشانی میں وہ کہہ گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ فون پر ہی آئی ہو۔

"تمہیں یہ لائن مجھ سے اس کے گھر روپے دوں گی۔"

اس لڑکی کی معصومیت پر مسکراتے ہوئے وہ اس کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ بڑھانا چاہ رہا تھا۔ جانے کیوں اس لڑکی کے ساتھ بولتے ہوئے اسے مزہ آنے لگا۔

"میں کوئی الو ہوں۔" وہ چڑ گئی۔

"تو کیسے میں ہو رہا ہوں تمہیں بولنے کی فیس ہوتی ہے۔ آج بیچنے کتنے بجے تک میرے ساتھ گپ شپ لگاؤ گی؟" وہ مذاق کے موڈ میں لگ رہا تھا۔

"میں کوئی نہیں کرنے والی آپ کو فون۔" وہ بولی اور طیش میں بھرے انداز میں بات کرنے کی شدید خواہش۔

"اچھا آپ کی مرضی ورنہ بندہ تو موجود ہے۔"

اس کی مسکراہٹ سے بھرپور آواز سے چڑ کر وہ ریسیور پٹخ چکی تھی۔ لیکن بے کلی سی نے سارا وقت بے چینی میں پایا تھا۔ پھر جانے کیسے وہ خود ہی اس کے ساتھ بات کا سلسلہ بڑھا گئی تھی۔ پھر اس سے اگلے دن پھر اس سے اگلے دن اور یونہی سلسلہ بڑھتا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ دونوں عشق محبت کے سمندر میں ڈوب چکے تھے۔

اعظم نے اسے اچھا کر دیا تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد مسلسل اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب سے عاصمہ نے اس کا گھیراؤ کیا ہوا تھا وقت کو بے بات کرنے کا تہیہ کر کے وہ اس کے کمرے میں آیا۔ وہ کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھے۔ ٹانگوں پر کمبل ڈالے نیم دراز وہ بڑی محویت سے کتاب پڑھ رہے تھے۔ جبکہ ماں کو اس نے نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ آہٹ پر وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ بیٹے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر وہ اتنی ہی سنجیدگی سے کتاب بند کر کے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اسے سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"بیٹھو۔" وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ باپ کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو بات کرنے آیا تھا وہ اس سے آگاہ تھے۔ اسی موضوع پر وہ کتنی بار بات ہو چکی تھی

اسے خود بھی یاد نہیں تھا آج وہ پھر اپنی قسمت آزمانے آیا تھا۔ آج پھر ایک لاحاصل بحث کی خاطر باپ کا سامنا کرنے پر مجبور تھا۔ مجبوری ایک ایسا دباؤ ہے جو انسان کو سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس انسان کو جس میں سب سے زیادہ غیرت ہو، چاہے انا ہو، چاہے خودی ہو، پھر انسان ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر مجبوری کا اعلیٰ نمونہ بن کر رہ جاتا ہے۔ انسان کے قدموں کی خاک تک بننے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی ہوا آج کل وہی بھی ہو گیا تھا۔ حالانکہ آج سے پہلے کبھی بھی اس میں وہ ایسی مرض کا شکار نہیں ہوا تھا۔

پھر کچھ لمحوں تک دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی راج کر رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد اس نے سر اٹھا کر نماز پڑھتی ماں کو دیکھا تھا پھر نظریں جھکا کر دونوں ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اسے باپ کی آواز سنائی دی۔ ایک رسمی جملہ تھا جو انہوں نے دہرایا۔ الفاظ اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے جانے کیوں اپنی ہار کا یقین ہو رہا تھا۔

"کیا کہنے آئے ہو؟" اب کی بار بھی اسے اس کے باپ نے مخاطب کیا تھا۔ ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال کر اس نے گمبھیر آواز میں اپنی چپ توڑی تھی۔

"عاصمہ کو اس کے گھر والے بیٹے کے لیے مانگ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اور امی دونوں اس کے گھر جائیں۔ کل کلاں کو اس کا رشتہ کہیں اور ہو جائے۔"

"بیٹے کے کہنے میں کیا شک ہے۔" "اس کی شادی کہیں اور ہو جائے گی۔" ابو نے بہت سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کتنی بار اس ٹاپک پر ہمارے بیچ بات ہو چکی ہے۔ اور کتنی بار میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔" باپ کا لہجہ درشتی اختیار کر گیا تھا۔ اس کی ماں جائے نماز تہہ کر کے ان کی طرف آ گئی تھی۔

ان کی باتوں میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے اس

خواتین ڈائجسٹ پبلی کیشنز
کی ایک خوبصورت پیشکش
نامور مصنفہ رضیہ جمیل
کا "ساگر دریا بادل بوند"
کے بعد مشہور و معروف ناول
اک گھروندا
اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
☆ خوبصورت سرورق
☆ مضبوط جلد
☆ آفسٹ پیپر
قیمت صرف =/300 روپے
کتاب منگوانے کے لیے
آج ہی =/330 روپے
کا منی آرڈر/بینک ڈرافٹ
ارسال فرمائیں۔
ملنے کا پتا
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی

نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "بیٹا میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں رجو آپا سے فرح کی بات کر چکی ہوں۔ اس کے میڈیکل کا عرصہ پورا ہوتے ہی میں تم دونوں کی شادی کر دوں گی۔ ابھی ہم منگنی کر دیں گے کہ ابھی اس کے تین سال رہتے ہیں میڈیکل کے۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ اسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"لیکن میں فرح سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کہہ چکا ہوں میں آپ سے۔ پھر آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟" اس نے قدرے تلخی سے کہا تھا۔

"شادی کے لیے تم نے جس لڑکی کو منتخب کیا ہے۔ کیا وہ ہمارے اسٹینڈرڈ والی ہے؟ جانتے ہو اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ کرائے کی دکان ہے اس کی اور اس کی بیٹی ٹیلی فون آپریٹر… اس لڑکی کے لیے اندھے ہو تم۔ یہ لڑکی ہمارے خاندان کے بیٹے کے ساتھ ست کرے گی۔ تف ہے تم پر اپنا نہیں تو کم از کم مجھ… رہے کا ہی کچھ خیال کرو۔" وہ برہم لہجے میں کہتے ہوئے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی حتی الوسع کوشش کر رہی تھیں لیکن جذبات کنٹرول میں آنے والے نہیں تھے اس کی ماں کچھ خود وہ ہو گئی تھی وہ اپنے شوہر کو ازحد اختیار کرنے کا کہنے لگی۔

"کیا اسٹینڈرڈ والے ماما؟ آپ ایک کلرک کے بیٹے تھے۔ آپ ایک مڈل کلاس فیملی سے اپر کلاس میں آئے ہیں۔ مڈل کلاس ہونا عیب نہیں ہے۔ اگر ان کا اسٹینڈرڈ ہائی نہیں تو اسے ہائی اسٹینڈرڈ آپ کا بیٹا والا بنائے گا۔ بیوی کا اسٹینڈرڈ شوہر والا ہوتا ہے اگر آپ ہی آپ انسانیت کی رو سے بہتر ہے اس سے۔" اس کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا تھا۔ اس کا … باپ کو اور زیادہ … گیا تھا۔ ان کے چہرے کی رگیں تن گئی تھیں۔ ان کا دل کچھ شدید ہونے لگا۔

"سچ کہا باپ کلرک تھا میرا۔ پر اب میں ایک اچھی … ہوں۔ ایک کیس کے میں لاکھوں لیتا ہوں۔ اور اپنا … اسٹینڈرڈ ہائی ہے۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔ وہ خاموش رہا اس پل اس کی نظریں جھک گئیں اور وہ اضطراری انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ باپ … ڈالنے سے اجتناب کر رہا تھا اس نے کبھی نظروں … حیثیت محسوس کیا تھا کہ اس کا باپ اسے شعلہ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک بار اس کی غصیلی سی آواز سنی تھی۔

"آخر وجہ بحث ہو رہی ہے اس بات پر کہ تمہاری شادی اس لڑکی سے ہرگز نہیں ہو گی۔ آج سے بلکہ اس ٹاپک پر بات مت کرنا۔ اگر ایک بھی لفظ کہا تم نے تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اگر تم میں ذرا سی غیرت ہو تو یہ نوبت نہ آنے دینا۔ لوگ ہنسیں گے … اب چلا جا یہاں سے۔" ان کے دو ٹوک لہجے اور تلخ انداز پر وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اب ہرگز نہیں ہارنے والا تھا اس کی ماں اس معاملے میں اپنے شوہر کی ہمنوا تھیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی اس گھٹیا خواہش کو پورا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ یعنی وہ بھی مجبور تھے معاشرتی اسٹیٹس "دولت …" مگر وہ … کے ہاتھوں وہ مجبور تو ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھا لیٹ گیا تھا۔ اس کا باپ کیوں ضد پر اڑا ہوا تھا۔ کیوں نہیں وہ اس کی بات مان رہا تھا۔ کیوں وہ اس کا دل دکھانا چاہتا تھا؟ ایسا سوچتے ہوئے اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ بھی ماں باپ کا دل دکھا رہا تھا۔ جب بیٹا خود خوشی کی انتہا پر کھڑا ہو جائے تو وہاں صرف میں دکھتا ہے۔ تم آپ کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ صرف میں کی سوچ فکر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی یہی سوچ حاوی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ آخری لمحے تک مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا اپنی محبت کے لیے وہ ہر جان سے لڑنا چاہتا تھا۔ وہ … لگا تھا۔

"تم آفس کیوں نہیں آ رہے ہو؟" … ناشتے کی ٹیبل پر غیر موجود پا کر جمال صاحب خود اس سے بات کرنے آئے تھے۔ آج اسے آفس سے غیر حاضری کا تیسرا دن تھا۔ اسے بستر پر لیٹے کتاب پڑھتے دیکھ کر انہوں نے سوال کیا۔ باپ کو اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر وہ پہلے ہی کتاب بند کر کے سیدھا ہو بیٹھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔" اس نے ذرا رکھے میں جواب دیا تھا۔

"تمہاری طبیعت کا تعلق انعم سے تو نہیں ہے۔" قدرے توقف کر کے پھر سے گویا ہوئے۔

"تیار ہو کر آفس آؤ۔" گھڑی پر ایک نگاہ ڈال کر وہ مزید بولے۔

"اگلے آدھے گھنٹے میں میں تمہیں آفس میں دیکھوں۔" جاتے جاتے ایک سرد نگاہ اس پر ڈال کر وہ کمرے سے چلے گئے۔ ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر ایک بار پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد بیزاری سے کتاب بند کر کے سوچتا ہوا اٹھا اور وہ تیار ہونے کے لیے اٹھ گیا۔

○ ○ ○

انعم کا رشتہ اس کے خاندان میں طے کر کے ایک مہینے کے اندر شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ اسے جب پتہ چلا تو وہ … اس نے اپنا سارا غصہ انعم پر نکالا … وہ بھی آج یہ … آیا ہے اس کی منت کرنے۔

"ٹھیک ہے میرے ماں باپ اب ساری زندگی تو مجھے اس آس پر نہیں بٹھا سکتے رہے اور پھر تم آج تک خود کو لاچار و مجبور ظاہر کرتے آئے ہو۔ آس امید کی کتنی … سنتے رہتے وہ کہے تمہاری محبت سے زیادہ اہم ماں باپ کی عزت ہے۔ وہ میں نہیں توڑ سکتی۔" اس کے خاموش ہوتے ہی وہ … کی آواز میں بولا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم میرے بنا نہیں رہ سکتیں۔"

"ہاں کہا تھا اور … اب بھی کہہ رہی ہوں کہ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔ لیکن مجھے رہنا پڑے گا اور ایسا کرنے پر مجھے تم مجبور کر رہے ہو۔ تمہاری بزدلی مجبور کر رہی ہے۔" وہ خاموشی سے اس کی لعن طعن سن رہا تھا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہ بھی درست کہتا تھا۔ غلط کون تھا۔ اس کا باپ یا اس کی قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ ان دونوں کے ستارے ملا ہی نہیں پائی تھی۔ وہ سامنے بیٹھی لڑکی کو کوئی دوش نہیں دے رہا تھا۔ وہ غلط نہیں تھی۔ قصور اس کا نہیں تھا اس لیے اس کی محبت اب بھی اسی شدت سے وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی دھڑکن کو سنا تھا۔ وہاں انعم ابھی تک … تھی یعنی انعم دل کے گوشے میں … تھی وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا اطمینان کی ایک ٹھنڈی میٹھی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ پارک کے پرسکون گوشے میں وہ وہاں بیٹھے تھے۔ سورج کی تمازت آج کچھ کم نہیں تھی جتنا اس پل اسے تھکا رہی تھی۔ وہ کچھ تھک کر رہ جانے میں ہو گیا۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ جاتی بہار کے موسم نے رنگ دکھا رکھا تھا۔ نزدیک پھولوں کے پودوں کی قطاریں تھیں۔ ان پھولوں سے پھوٹتی خوشبو بھلے دل کو راحت پہنچا رہی تھی۔ اک بے چینی ذہن میں … کر رہی تھی۔ اردگرد کے سارے حسن کو اس لڑکی کے آنسو پھیکا کر رہے تھے۔ سرسبز گھاس پر … ہو کر اس نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا رکھی تھیں اور اسے … دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ لڑکی کی بڑی بڑی آنسو آنکھوں میں … کر رہے تھے … قسمت … تھی وہ سوچ رہا تھا۔

"عورت بڑی بے چاری ہوتی ہے۔" وہ … نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف بیٹھی لڑکی اس کے تاثرات سے اس کے احساسات سے انجان اسے ایک بزدل بے حس "وحشت انسان" گردانتے ہوئے اٹھ گئی۔

"میں جا رہی ہوں پر آج تمہیں بتا دوں کہ میں تمہاری بزدلی اور بے حسی کو کبھی نہیں بھولوں گی۔" اس نے ایک سپاٹ نگاہ ڈال کر وہ مختصر اور … آواز میں … ہوئے قدم … چل پڑی۔ اس وقت اس کی نظریں زمین پر پڑنے والے اس کے قدموں کے نشانات پر تھیں۔ انعم کی خوشبو پر رشک کر رہی تھیں۔

وہ آفس نہیں جا رہا تھا۔ اس کا باپ اس کا سارا غصہ اپنی بیوی پر نکال رہا تھا۔ "اور بگاڑو اسے تم نے سر

چڑھ جاتا ہے۔ سوگ منا رہا ہے۔ اس کی شادی کیسی اور کیا ہوئی تھی اس کے ساتھ۔ سوگ ہی ختم نہیں ہو رہا۔ اسے کو آج بھی اس سے اتنی محبت تھی۔"

دو سال بعد بھی بہت کچھ کہتے رہتے تھے ساتھ ہی اس کی الجھنیں اور نیلیوں بھرے الفاظ بھی اسے اپنے کمرے میں بیٹھے سنائی دے رہے تھے۔ اس وقت وہ دونوں لاؤنج میں تھے۔ وہ بستر پر لیٹا باپ کی بے حسی اور اس کے بے رحم رویے پر سوچ رہا تھا۔ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ جس ماتم کو چھپا رہے ہوں چاہتے ہیں کہ زبان سے وہ تو بھی نہ نکالے۔ اتنے سفاک کیوں ہوتے ہیں وہ؟

"میرا باپ مجھے کھل کر ماتم کیوں منانے نہیں دیتا؟ سوگ کیوں نہ مناؤں؟ جانے والے کا تو سوگ منایا ہی جاتا ہے۔ ٹھیک ہے میں سوگ نہیں مناؤں گا مگر وہ مجھے ماتم بھی منانے دو۔ ——— یکدم سے وہ بستر سے اٹھ گیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا گلاس اٹھا کر اس نے دیوار پر دے مارا تھا۔ کانچ ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ کانچ کے بکھرے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے وہ باتھ روم جا کر [illegible] شکستہ لمحے میں ہر چیز اب ساتھ ہوتے وقت [illegible] بے رحم ہو رہا تھا۔

"کھانا تمہارے پاس کیوں لایا اور تم نے لینے سے انکار کر دیا کیوں؟" رات کھانے کی ٹیبل پر اس کے باپ نے اس موضوع کو چھیڑا۔

"کیس ویجیٹیبل تھا۔" پلیٹ سے گرم روٹی نکال کر جاتے دیکھتے اس نے اتنی ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس نے خود پر باپ کی گرم نظروں کو محسوس کیا۔ جسے نظرانداز کر رہا تھا۔

"ایسا ہی ایک کیس تم پہلے بھی کر چکے ہو اور جیت چکے ہو۔" وہ کھانے سے ہاتھ روک چکا تھا اس کی بات کو اہمیت دیتے ہوئے وہ یکدم سے بولا۔

"وہ مجھے ویجیٹیبل نہیں لگا تھا اور یہ لگ رہا ہے۔" نوالہ منہ میں اٹکتے ہوئے اب کی بار وہ باپ کو دیکھنے پر مجبور تھا۔

"کیا سنجیدگی ہے اس میں؟" اب کی بار باپ کے لہجے میں اس نے خفگی کی آمیزش محسوس کی۔

"آپ کے لیے نہیں ہوگی پر میرے لیے تھی۔" اس نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"وضاحت کرو گے۔" اس نے نوٹ کیا تھا اس کا باپ کھانے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا اور اس کی ماں پریشان چہرے سے کبھی اسے دیکھ رہی تھی کبھی اپنے شوہر کو۔

"ضروری نہیں ہر چیز آپ کو درست لگے وہ مجھے بھی درست لگے۔ جس طرح آپ کو میرا کوئی ایک عمل برا لگ سکتا ہے۔ اسی طرح مجھے بھی آپ کی درست سوچ سے اختلاف ہو سکتا ہے۔" جمال اعوان کے چہرے پر شکنیں ابھرتے ہی امی یکدم سے بول پڑی تھیں۔

"تم دونوں نے کھانے پر کیا فضول بحث چھیڑ دی ہے اب اس فضول کی بات چیت کو ختم کرو اور کھاؤ۔" بیوی کی بات کے جواب میں جمال خاموش رہے۔ کرسی کھسکا کر وہ اٹھ گئے جاتے جاتے انہوں نے اپنے بیٹے کے جھکے سر اور مصروف انداز پر کافی بے رحم نگاہ ڈالی تھی۔ ان کے جاتے ہی کلثوم اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"یہ کباب لو میں نے تمہارے لیے خود تیار کیے ہیں۔" کباب اٹھا کر وہ سہولت سے کھانے لگا۔ جبکہ پاس بیٹھی ماں کھانا چھوڑ کے گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اللہ نے ایک ہی اولاد دی تھی۔ جو اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ لیکن اس جان سے زیادہ عزیز اولاد کی کچھ "خواہشات" اسے بالکل بھی عزیز نہیں تھیں۔

وہ آفس جانے لگے اور بات کو اب وہ مت ختم [illegible] الجھا ہوا ہو گیا تھا اداسیوں کے محرمت میں گزرتے دن رات دن بدن اس کی اداسی میں اضافہ کر رہے تھے۔ الجھن کیا اب بھی دل میں موجود تھی۔ کیونکہ وہ بے وفا نہیں تھی یہ بات خود کو بھی نہیں سمجھتا تھا۔ مجبور تھی۔ وفا کہاں تھی۔ دنیا کے ہر مجبور سے کسی محبوب محبوب پر سے وفائی کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے؟ حالانکہ وہ بے وفا نہیں ہوتے۔ مجبور ہوتے ہیں۔ ——— وہ دن بھر یہی سوچتا رہتا۔

اپنے غم کو بھلانے کی خاطر وہ آج کل ایک لمبی واک پر نکل جاتا۔ رات کو دیر سے گھر واپس آتا۔ کچھ دیر کی آوارہ گردی سے ذہن کو کچھ سکون حاصل ہوتا تھا۔ ذہن پر چھائی رنجیدگی کچھ وقت کے لیے کم ہو جاتی تھی۔ رات کھانا کھاتے ہی وہ گھر سے نکلا تھا۔ رات کے وقت شفاف سڑک کے کنارے اپنی سوچوں میں گم وہ چلا جا رہا تھا۔ اس وقت موسم سرما کی آمد بھی ہو چلی رہی تھی۔ کہیں کہیں پھولوں کی بھینی مہک ہوا میں شامل ہو کر فضا کو معطر کر رہی تھی۔ دلفریب موسم کے دلفریب نظارے صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس کا دل کسی غم کی پرچھائیں سے، یادوں کی کسی کسک سے، یا اداسی کی کیفیت سے ناواقف ہو۔ اس وقت وہ حسین موسم کو محسوس کر کے خود کو بہلانے سے بہلا رہا تھا یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے وہ کافی دور نکل گیا۔ عجیب سے دل کی حالت اس سڑک پر بھی کبھار سانس پھول جاتی۔ اور خود کو سنبھالنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا تھا۔ شفاف سڑک پر چہل قدمی کرتے کے دوران اس کی سانس کافی پھول چکی تھی۔ کچھ دیر کے لیے وہ سڑک کے کنارے موجود درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گہری گہری سانسیں لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ کافی عرصے بعد وہ واک کے لیے نکلا تھا سانسوں کا پھول جانا بھی تھا۔ وہ گھر سے وہیں ٹھنڈے والی ڈسٹنس پر واقع پارک میں جوگنگ کرنے جایا کرتا تھا۔ پر یہ سب کچھ عرصے سے چھوٹ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تو وہاں سے چل پڑا تھا۔ چہل قدمی جاری رکھتے ہوئے وہ ایک دم سے مین روڈ پر گیا تھا۔ [illegible] کے بورڈ پر ایک [illegible] کے پیچھے گیا تھا۔ اس وقت [illegible] روشن تھیں۔ بے اختیار اس کی نگاہ ایک کھڑکی پر پڑی تھی۔ جس کا رخ سڑک کی جانب تھا۔ وہاں موجود وہ لڑکی ہاتھ میں لیے کمرے میں کھڑی نظر آیا تھا۔ ساتھ ہی کھڑکی سے انگریزی گیت بھی سنائی دیا تھا۔ وہ مسکرا کر سر ہلاتا اس گھر کو کراس کر گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر کچھ شاپس تھیں۔ ایک جنرل اسٹور، کیمسٹ، آئس کریم پارلر اور [illegible] اسٹور کی جانب بڑھا۔ اپنے لیے چیونگم اور [illegible] خرید کر وہ پارک کا بھی ایک لمبا چکر لگا کر وہ پارک کے گیٹ تک جا پہنچا۔ واپسی میں اسے کچھ دیر ہو گئی۔

"سر اس وقت پارک بند ہے آپ صبح آئیے گا۔" ملازم نے نہایت مودبانہ انداز میں اپنا فرض ادا کیا۔

"اپنا ہے کہ پارک بند ہے۔ میں بس کوئی کام [illegible] اختیار تمہیں ہیں کہ جس سے میں اس پارک کو اڑا دوں۔ آپ میری چیکنگ کر سکتے ہیں چیکنگ کے بعد اگر آپ [illegible] میں اپنے کسی بھی کام سے میرا ہوں تو آپ مجھے اندر جانے دیجیے گا۔" اس کی دھیمی گمبھیر آواز سے وہ کچھ پل کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ دراصل آج وہ کچھ دیر سے آیا تھا۔ چوکیدار اپنی جگہ درست تھا۔ چوکیدار فوراً بولا تھا۔

"سر آپ شرافت سے [illegible] آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کو جانتا ہوں کہ آپ اچھے شخص ہیں۔ ہماری بھی مجبوری ہے کہ اوپر سے آرڈر ہے۔"

"تو میں اندر جا سکتا ہوں؟" اس نے اس کی بات کاٹ کر حتمی لہجے میں کہا تھا۔

"سر کیوں نہیں۔" اس نے اس کے لیے بڑا آہنی گیٹ کھولتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اندر گیا تھا جبکہ [illegible] پلٹ کر ختم ہو چکا تھا اس کی [illegible] ادھر ہی تھی۔ "مجھے استعمال کیجیے" کے الفاظ پر نظریں پڑتے ہی وہ قریب آ کر اس کی خواہش پوری کر چکا تھا۔

جب انسان کے چاروں طرف اداسی ہو تو پھر وہ کسی بھی چیز میں نہیں آتا۔ اسی وقت وہ صرف اداس ہونے میں آتا ہے۔ اسی لیے وہ بھی خود کو مزید اداس کرنے لگا تھا۔ [illegible] تحریر نے اس کے جذبات میں کچھ اور لکھا تھا اس کے جذبات سے متاثر ہو کر [illegible] کر دیا تھا۔ وہ اپنی فرنٹ کے ساتھ گھومتے پھرتے کافی دیر پارک کے گیٹ کو کھلا دیکھ کر وہاں موجود چوکیدار کے پاس آ گئی تھی۔

"چوکیدار صاحب یہ گیٹ کیوں کھلا ہے۔ رات کے اس سناٹے میں بغیر اجازت کے تو آپ نے کبھی بھی اس وقت نہیں کھولا۔" اس نے چوکیدار سے کچھ دن پہلے والا رویہ اپنایا تھا۔

"ہاں جی ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس دن شبو وغیرہ کتنی ضد سے یہاں آئی تھیں۔ لیکن اس چوکیدار کے بیٹے نے گیٹ کھول کر ہی نہ دیا۔" ساتھ ہی ساتھ اماں نے چھیڑا تھا۔

"دیکھو بیگم صاحبہ! رات کے وقت پارک کے گیٹ کی کھولنے کی اجازت نہیں آج کل کے حالات۔" ایک بار پھر اس کی بات کو کاٹا گیا تھا۔

"ہم معصوم لڑکیاں آپ کو دہشت گرد نظر آ رہی ہیں۔ کتنے ہیں ہم ظالم۔" معصوم نے تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر چہرہ اٹھا کر رکھتے ہوئے تقریباً چیختے سے کہا تھا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہو بی بی۔ جائے سرکار سے لوگ اندر ہو صاحب گئے ہیں باہر سے آپ کو آپ کا کیس مفت میں لڑے گا۔ آپ کی مسکینی کے باعث۔" چوکیدار جل بھن گیا تھا ابھی طنز کے تیر سے وار کر گیا تھا۔

"کیا اندر کوئی موجود ہے؟" انہیں جو بے دلی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی یکدم اچھل پڑی تھی۔

"ہاں جی ابھی ایک صاحب آئے تھے۔ آپ کی طرح وہ اداس ہو رہے تھے۔ اسی لیے کھولا ہے میں نے گیٹ۔" اس نے رک رک کے سوال کا جواب دیا۔

"ہم اندر جا سکتے ہیں؟" نہایت شرافت اور خوشامدانہ لہجے میں سوال کرتے ہوئے اس نے اجازت طلب کی تھی۔

"ہاں جاؤ پر جلدی واپس آنا ہو گا۔" اس کے بے زار لہجے سے انہیں بے زار کیا وہاں سب سے توقع کی بالکل نظرانداز کر کے خوشی خوشی اندر چلی گئی تھیں۔

"یہ دیکھو وہ پارک میں آیا ہے۔" انہیں ثمین کی شوخ آواز سنائی دی تھی۔

"کیوں؟" باقی سب نے یک زبان سوال کیا تھا۔

"بھئی نامحرم ہے۔ تھوڑا تنگ کریں گے لڑکیوں کو۔" باقی سب اس کی بات پر ہنسنے لگی تھیں۔ وہ پارک کے لان میں ایک بازو آنکھوں پر رکھے لیٹا تھا۔

"دیکھو وہاں کوئی لیٹا نظر آ رہا ہے۔" پارک کی روشن لائٹس میں ایک لیٹا ہوا انسان با آسانی نظر آ رہا تھا۔ اماں نے چلاتے ہوئے باقی سب کو اشارے سے دکھاتے ہوئے تائید کی تھی۔ وہ پانچوں ادھر چل پڑی تھیں۔ اس کی سوچ کا تسلسل اس وقت ٹوٹا تھا جب اسے اپنے گرد کچھ آوازیں سنائی دی تھیں۔ اپنی آنکھوں سے اپنا بازو ہٹا کر وہ اپنے گرد لڑکیوں کو دیکھنے لگا تھا۔ پھر نہایت خاموشی سے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ بازو گھٹنوں کے گرد باندھ کر وہ اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ چکا تھا۔ اس کی اس بے نیازی اور سنجیدگی پر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔

"لگتا ہے ہم اسے پسند نہیں آئیں۔" ایک آواز اس کے پاس ابھری تھی۔

"اور کیا ہم اتنے اچھے ہیں کہ ہمیں خود نہیں پتہ کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔" ایک اور شوخ و شنگ کھلکھلاتی آواز سنائی دی تھی۔

"سنو ہم کتنے خوبصورت ہیں۔" ایک اور آواز کانوں میں پڑی تھی۔ ان زندگی سے بھرپور آوازوں کا اس ہونے غم کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔ کیونکہ غم صرف اس کو تھا۔ وہ اس کے غم سے آشنا ہو بھی کیسے سکتی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"آپ کہیں شاعر تو نہیں۔ اکثر شاعر حضرات خود پر اداسی طاری کر کے شعر کہنے کی تیاری کرتے ہیں۔" اب کی بار وہ اس جانب بڑھی زرد لباس میں ملبوس ثمین نے بھی شرارت کی تھی۔

"نہیں نہیں یہ شاعر نہیں یہ مصور ہو گا دیکھو نہیں رہیں۔ رات کے اس نظارے کو کینوس پر اتارنے کے لیے یہ شخص پارک کا جائزہ لینے کے لیے اس وقت آیا ہے۔" ایک اور مذاق اڑاتی آواز گھٹنوں سے سر اٹھا کر اپنے ہاتھ کھول چکا تھا۔

"اس سارے علاقے میں صرف میں ہی ہاتھ لگا آپ سب کے۔" پھر اس پر نظریں اٹھا کر کہتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔

"میں شاعر تو نہیں ہوں پر آپ سب پر ایک دیوان لکھ سکتا ہوں اور جہاں تک مصوری کی بات ہے تو تیری میری میں شکلیں بھی بنا سکتا ہوں۔ اگر آپ سب چاہیں تو آج یہ کام ہو سکتا ہے۔" وہ سب ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔ آخری بات نے انہیں ہوا دیا تھا۔ اپنی تیری میری شکلیں دیکھنے کی ہمت ان میں سے کسی میں نہیں رہی تھی۔ یہ معاملہ بیچ نازک ہو گیا تھا۔

"میں شکر بھی ہوں۔ کبھی کبھار ایک دو کا ہی ہاتھ لیتا اگر کوئی برداشت کر جاتا ہے تو۔" کچھ دیر کے لیے وہ خاموش رہ کر ان سب کی خاموش صورتوں کو تکنے لگا تھا۔ پھر دل ہی دل میں ہنسنے لگا تھا۔

"اب آپ جانتے ہیں شعر سننا چاہیں گی؟ یا تصویر بنوانا چاہیں گی؟ یا پارک کو سننا چاہیں گی؟" ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے وہ بہت ہی اطمینان اور پرسکون انداز میں کہہ گیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا ان سب کی آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہوئے سرعت سے مڑی تھیں اور تقریباً بھاگنے کے انداز میں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی پارک سے نکل گیا تھا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر "اس کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے خوش اخلاقی سے ملا تھا۔

"صاحب جی اب تو کوئی شکوہ نہیں نہ۔" اس کی بات پر مسکراتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"ہاں اگر شکوہ کروں گا تو پھر کے کھلاؤں گا۔" چوکیدار ہنسنے لگا تھا۔ وہ سلام کر کے اپنی سڑک پر چل پڑا تھا۔

دوسری رات جانے کیوں اس کے دل میں واک کی شدید خواہش جاگی تھی۔ ذہن میں کل رات ان لڑکیوں سے ہونے والی ملاقات کے نقوش اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ثبت تھے۔ کیا تھا اگر وہ بھی زندگی سے لطف لے؟ ذہن میں سوال ابھرا تھا کیا تھا اگر وہ بھی وہ گھڑی ان لڑکیوں کی طرح خوشی خوشی لے لے؟ اس میں کوئی قباحت تو نہیں ہے کسی کی۔ وہ اور کسی نے اس میں اس کی خطا تو نہیں تھی۔ پھر انتقام وہ کس سے لے رہا تھا۔ خود سے یہ کیوں ایک تھکن بھی بھی کوئی ہنستا ہو تو اسے سوچتا رہتا تھا۔ الجھتا رہتا تھا۔ کبھی سوچتے سوچتے زندگی سے اکتا جاتا ہے بھی حق حاصل ہے کہ وہ زندگی سے لطف لے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"زندگی تھوڑی سی ہوتی ہے اسے ہنستے کھیلتے گزارنا چاہیے۔" وہ سوچ رہا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ لیکن صرف چوکیدار کے سلام کا جواب دے کر گھر سے نکل گیا۔ پھر کافی دیر تک وہ واک کرتا رہا۔ آج اسے واک کرنے میں ایک عجیب سی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ آج وہ اپنے دل کو سمجھا بجھا کر لایا تھا کہ وہ بھی خوشی خوشی جی لے گا۔ زندگی چند دن ہے۔ کافی دیر تک گھومتے پھرنے کے بعد وہ کافی بار کے باہر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اپنے لیے کافی منگوا چکا تھا۔ اس نے بھاپ اڑاتی کافی کا ایک گھونٹ لے کر کپ رکھ دیا تھا۔ ان مست ہوا اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کافی سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ قریب کی کرسیوں پر بیٹھے کچھ حضرات ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اس تنگ موضوع سے وہ کچھ چڑنے لگا تھا۔ لیکن دل اس وقت خوش ہوا تھا جب ان میں سے ایک بولا تھا۔

"یار ہمیں کیا جو ہو رہا ہے ہم تو نہیں کر رہے۔ جانے دو اس فضول کی بحث کو۔" اس کے کہتے ہی وہ دونوں بھی اس ٹاپک کو چھوڑ کر اپنے گھر کے مسائل ڈسکس کرنے لگے۔ اس نے کافی ختم کر دیا۔ کافی کے کپ سے جلد اڑ رہی تھی۔ وہ زیادہ گرم کافی نہیں پیتا تھا۔ کپ یونہی ٹیبل پر پڑا تھا۔ جبکہ اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

آج وہ ایک عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ

اور کر بیٹھ وہ ذرا فاصلے پر اس کی نظروں سے دور سے تین لڑکیوں کے گروپ کو دیکھتا تھا۔ وہ تینوں چیخ کر چلتی ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہنسی مسکراتی کھلکھلاتی ہوئی ادھر اُدھر سب کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ادھر اُدھر ڈالی تو آس پاس سے بہت شوق نگاہوں سے انہیں گھورتے نظر آئے۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ "مرد بھی کبھی نہیں بدل سکتے۔" وہ سوچتے ہوئے خود بھی مسکرا دیا تھا۔ بہرحال خود بھی ایک مرد تھا۔ وہ چونکا۔ وہ گروپ اس کی جانب آرہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اسی کی جانب اشارہ کیا تھا۔ باقی سب نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مارا تھا۔

"ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔" ان میں ایک بڑے شائستہ انداز میں بولی تھی۔ اس کے سر ہلانے پر سب کی سب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"پہچانا آپ نے ہمیں؟" وہی پہلی مخاطب ہوئی تھی۔

"ہاں۔" اس نے اقرار کیا تھا۔

"آپ کافی پی رہے تھے۔" ایک بار پھر وہی مخاطب تھی۔ ساتھ ہی اس نے ملازم لڑکے کو آواز دے کر کافی کا آرڈر دیا تھا۔ "ہاں تو کہئے ۔۔۔ رات کو سونے سے پہلے آپ نے ہمیں یاد کیا؟" اس بار سرخ لباس میں ملبوس لڑکی بولی تھی۔ وہ جواب میں انداز میں مسکرا دیا تھا۔

"آپ سب کو کیا لگتا ہے؟" وہ جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"ہمیں یقین ہے کہ آپ نے ہمیں ضرور یاد کیا ہو گا۔ ہمیں تو آج ہمارے انتظار میں بیٹھے اس موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔" پہلی والی لڑکی نے داد طلب نظروں سے باقی سب پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ باقی سب نے تائید کی۔ وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔

"آپ کہتے ہم سچ بولنے لگا تھا۔" ایک بار پھر وہی لڑکی مخاطب تھی۔

"حسین لڑکیاں ہمیشہ سچ ہی بولتی ہیں۔" اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بالکل آزادانہ انداز میں کہا تھا۔

"بائی داوے یہ جملہ آپ نے ہمیں بے وقوف سمجھ کر تو نہیں کہا۔" کچھ توقف کے بعد وہ کچھ غیر یقینی بولی تھی کہ ابھی کوئی بول اٹھی ہے۔

"حسین جو بھی ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔" اس بار دوبارہ جملے میں وہی جملہ استعمال کر بیٹھا تھا۔ "مجھ کو ہمیشہ پسند ہے [illegible]" اس نے تحمل سے بیٹھا ساتھ مار کر ان سب کو دیکھتے ہوئے تمام لہجے میں کہا تھا۔ ملازم ٹرے میں کافی کے کپ لے کر ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کپ انہیں تھما کر چلا گیا تھا۔

"آپ کا نام کیا ہے شاعر صاحب؟" وہی پھر سے مخاطب تھی۔

"مسعود جلال۔" وہ ان کی گپ شپ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

"میرا نام ہے تمکین اور یہ میری فرینڈز ہیں۔" پہلی والی نے سب کا تعارف کروانے کی [illegible] تھی۔ "ایک غم سے ایک دکھ سے ایک تکلیف سے زندگی ختم نہیں ہوتی۔ جہاں غم کا احساس کم ہوتا ہے وہیں سے خوشی شروع ہوتی ہے۔ اس شخص کی زندگی میں بھی خوشی داخل ہو گئی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ زندگی ایک غم سے ختم نہیں ہوتی۔ دکھ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن دکھ کا احساس جب انسان ختم کرنا چاہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی دکھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس احساس کو خود ختم کرنا ہوتا ہے کہ وہ ایک دکھی انسان ہے۔ ایسا احساس دکھ کو بیکی کی شکل میں پیش کرنے لگا تھا۔ اس رات وہ سب اس سے بڑے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتی رہیں۔ وہ سب آزاد خیال گھرانوں کی لڑکیاں آزاد خیال لڑکیاں تھیں۔ اسے ایسی لڑکیاں کبھی بھی پسند نہیں رہی تھیں۔ لیکن اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ آگے ایسی لڑکیوں کو بے تحاشا پسند کرنے لگے گا کیونکہ وہ بھی ان میں سے ایک تھی۔

پھر وہ ان سے ملنے لگا تھا اور ایسا وہ جان بوجھ کر کرنے لگا تھا۔ وجہ دکھ سے فرار کی تھی۔ زندگی سے خوشی کشید کرنے کی تھی۔ وہ لڑکیاں نہیں تھیں

خوشیاں، رعنائیاں تھیں۔ اندر سے غم کو تکلیف کو ختم کرنے والی ہستیاں تھیں۔ اسے ایسی ہی زندگی سے بھرپور ہستیاں چاہیے تھیں جو اسے جینے پر مجبور کریں۔ دھیرے دھیرے وہ پھر سے اپنے معمول میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ مگر اب بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح اس کے ذہن پر طاری نہیں رہتی تھی۔ اس کی محبت میں تھی پر وہ ایک یاد کی صورت تھی۔ یادیں اس وقت آتی ہیں جب انسان فارغ ہو۔ مگر اب وہ مصروف [illegible] اس کو تو وقت نہیں تھا کہ کسی کی [illegible] آگے [illegible] ہے۔

وہ آفس جانے لگا۔ اس کی روٹین اعتدال پر آگئی۔ آفس پھر گھر کچھ دیر آرام اس کے بعد جم خانہ اور پھر رات کے کھانے کے بعد واک اور پھر ایک کافی اور پھر ریسٹ۔ شام کو تو تازہ کھلا کھلا سا وہ باہر لان میں [illegible] آیا تھا۔ ملازم بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

"صاحب جی آپ کا فون ہے۔" اطلاع دے کر وہ جانے لگا تھا کہ اس نے آواز دے کر پوچھا۔

"کس کا ہے؟" اس وقت اس کا موڈ کسی بھی دوست سے بات کرنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ آج وہ دل بھر کر گھر پر ریسٹ کرنا چاہتا تھا۔

"صاحب جی، وہ تو نہیں پتہ۔" اس نے معذرت طلب ظاہر کی۔

"سو بار کہا ہے کہ جب بھی میرا فون آئے نام پوچھا کرو۔" وہ اسے ڈانٹتے ہوئے آگے بڑھا۔ اندر آکر اس نے فون ریسیو کیا۔ طبیعت میں بے زاری کا عنصر غالب تھا۔

"ہیلو۔" اس کے جواب میں فوراً کہا گیا تھا۔

"پہچانا؟" وہ کوئی ہنسی تھی کھلکھلاتی ہوئی۔ وہ [illegible] تھا۔

"نہیں۔" دوسری طرف پھر قہقہہ گونجا۔

"ارے نہیں پہچانا آپ نے۔" "آپ کی بار آواز بھی پہچان لی گی۔"

"میں بات کر رہی ہوں۔" اس نے بڑا اٹھتی سے کہا تھا۔

"او سوری پہلی بار آپ کی آواز فون پر سنی تو اس لیے پہچان نہیں پایا۔ سوری تو ویری مچ۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے۔"

"آپ کو ہمارا نمبر کیسے معلوم؟" وہ حیران تھا کہ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے اسے نمبر دیا ہو۔ وہ بات کو الجھاتے ہوئے [illegible] لگی تھی۔

"بس ہو جاتا ہے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"تم ایسا کرو [illegible]" ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ کر وہ سر اس کی پشت پر ٹکا چکا تھا۔

"اچھا چلو میں بتا دیتی ہوں۔ ہوا یہ کہ آپ نے اپنا نام بتایا تھا کہ آپ کے والد وکیل ہیں۔ اتنے بڑے وکیل کے بیٹے کا فون نمبر ڈھونڈنا ہمارے لیے مشکل نہیں ہو گا کیا؟" اس کی وضاحت پر وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"تو یہ تو میں بالکل بھول گیا تھا۔"

"ہم یہ رابطہ برقرار رکھ سکتے ہیں نا؟" اس نے خوشدلی سے کہا۔

"آف کورس۔" اس بار بھی اس نے مختصر کہا تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ یہیں سے ان کے بیچ ایک [illegible] رابطہ بحال ہوا تھا۔ بہت جلد ان کے درمیان باقاعدہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ لڑکی اسے شروع سے اچھی لگی تھی۔ اس کی دوستی میں وہ خوشی، سکون، راحت محسوس کرتا تھا۔ وہ اس بات سے انجان تھا کہ اسے راحت، سکون دینے والی اسے [illegible] بے سکونی [illegible] ذہنی الجھن میں مبتلا کرے گی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو وہ کبھی بھی اس سے نہ ملتا۔

⊙ ⊙ ⊙

گہری نیند میں خلل ٹیلی فون بیل سے پڑا تھا۔ بیل تسلسل سے جاری تھی۔ [illegible] فون اٹھا کر اس نے کال ریسیو کی۔ ساتھ ہی ساتھ سائیڈ ٹیبل پر پڑی

رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھنے لگا۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔
"ہوں۔" متفکر سی ابھری آواز میں ہولے سے کہا گیا تھا۔
"ابھی تک سو رہے تھے شام کے چھ بج رہے ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ، آدھے گھنٹے میں تم مجھے گولڈن پارک کے نزدیک ریسٹورنٹ میں مل رہے ہو۔ دیر نہیں کرنا ورنہ میرا انتظار غصہ بھی بن سکتا ہے۔" وہ ہنستی رہی وہ فون بند کر چکی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لے کر ساری تھکن مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند سے طبیعت کافی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر واش روم میں نہانے چلا گیا۔ تیار ہوتے ہی وہ ریسٹورنٹ کی جانب گاڑی دوڑانے لگا۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑی روک کر وہ اندر گیا تھا اور داخل ہوتے ہی وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے اسے تلاش کرنے لگا تھا۔ سامنے کی ٹیبل سے پچھلی ٹیبل پر بیٹھی وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر اس کی جانب بڑھا تھا۔
"ہیلو۔" اس کے قریب کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے وہ مسکرا کے بولا تھا۔
"ہوں ٹھیک وقت پر پہنچے ہو۔ میں بھی وقت کی کتنی پابند ہوں۔" وہ اترائی۔ وہ اور بھی مسکرایا تب تک بیرا آ چکا تھا۔ اس کے سرہانے پر ایک کرسی اٹھا لایا کر وہ سرسری نگاہیں دوڑانے لگا۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے اس نے ویٹر کو بلایا۔ چائے کا آرڈر دے کر وہ ایک بار پھر اس سے مخاطب تھا۔
"وکالت کیسی چل رہی ہے جناب عالی!" اس کے لہجے میں شگفتگی تھی۔
"اب تو بہت بہتر چل رہی ہے ویسی ہر گز نہیں جو پہلے تھی۔" اس نے بے ساختگی میں جواب دیا تھا۔
اس مبہم جواب پر وہ کچھ الجھتے ہوئے کہہ اٹھی
"تو پہلے کیسی چلتی تھی؟"
"کچھ خاص نہیں۔" اس نے گول مول جواب دیا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں داخلی دروازے سے اندر آنے والی ایک حسین لڑکی پر تھیں۔
"کیوں؟" اس نے سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
"بس۔" جواب مختصر تھا۔ وہ بھی اس کی نظروں کی تقلید میں آنے والی لڑکی کو دیکھنے لگی۔ پھر بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی۔
"کوئی خاص وجہ ہو گی؟"
"ہوں۔" وہ چونک کر نظر ہٹا کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ وہ لڑکی ان سے چار ٹیبل چھوڑ کر اگلی ٹیبل پر بیٹھ چکی تھی۔ بھرپور وضاحت بھری آواز میں بولا تھا۔
"ان دنوں بہت سے کیس ہارا ہوں۔" اس نے تھک کر آنکھیں پونچھ لی ان کو بند کیا تھا۔ آنکھوں میں کوئی عجیب سا اضطراب تھا۔
"کیس ہار جانا اصل ہے؟" بات طول پکڑ رہی تھی۔
"کیس ہار جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"
"میں ہی اصل میں کو ٹالنا چاہتا تھا جبکہ چاہا کہ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ کام کروں۔ اس کی بات تھی۔" جھوٹ بول کر وہ اسے تکنے لگا۔ وہ اسے دلچسپی سے نظر آئی تھی۔
"اگر جھوٹ کا وجود نہ ہو تو لوگ کس طرح زندگی گزارتے۔ آج کے دور میں تو جھوٹ سے ہی ہر بندہ خود کو دوسروں کو مطمئن کرتا ہے۔" وہ گہری سوچ میں گم کچھ سوچے جا رہا تھا۔ اسے اپنے جھوٹ سے گھن آ رہی تھی۔ لیکن یہ ضروری جھوٹ تھا۔ وہ خود کو مطمئن کرنے لگا تھا۔ وہ اس لڑکی سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی سنگت نے اسے زندگی دی تھی۔ وہ زندگی تھی۔
"باہر دیکھو آسمان پر کیسی زردی چھائی ہوئی ہے۔" اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ باہر سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیاں بھاگتے مست قدموں سے چلتے راہ گیر ان کی نگاہوں کے زد میں تھے۔ اسی دوران چائے آ گئی۔ چائے پینے کے دوران وہ ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ شام گہری ہوتے دیکھ کر انہوں نے جانے کا قصد کیا۔

صرف کر کے وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔
"اچھا ہے وہ کچھ سنبھل گیا ہے۔ باقاعدگی سے آفس آ جاتا ہے۔" اس کا باپ اپنی بیوی سے مصروف گفتگو تھا۔
"میں ہر وقت یہی دعائیں ہی تو مانگتی رہتی ہوں کہ اللہ اسے بچا لے ہر خطرے سے دور رکھے۔" اس کی ماں کا لہجہ پر فکر ہوا تھا۔
کچھ توقف کے بعد اس کے باپ کی آواز ابھری تھی۔
"میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں کیوں اس کا برا چاہوں گا وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ لیکن مجھے گلہ/شکایت تب پیدا ہوتی ہے جب وہ ہماری کسی خواہش کا احترام نہیں کرتا۔ ہماری ایک ہی اولاد ہے۔ جب وہ بھی ہماری خواہشات سے منہ موڑ لے تو مجھے بہت مایوسی ہوتی ہے۔ میں اس سے بہت امید رکھتا ہوں میں نے اس کی الجھنیں دیکھیں وہ معمولی سی بات کو وہ نہیں کرتے گے۔ میں نہیں چاہتا کہ آج کل کی طرح آفس کو ٹال کر جائے۔ جب سب ہے ساختہ بیٹے کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ اندر سے میرا دل خوش ہو کر اسے دعا دینے پر مجبور کرتا ہے۔ کسی کی چاہت ہے ایک۔" "وہ آج کل بہت مصروف رہتے تھے۔ وہ اپنے دوست کی شادی میں جانے کا سوچ رہا تھا۔ والد نے بھی گھر آ کر اپنے متعلق ان کی باتیں اچھی طرح سے سننے پر مجبور ہوا تھا۔ اپنے متعلق اتنے اچھے خیالات سن کر اسے لاشعوری طور پر خوشیوں سے ہمکنار کر چکے تھے۔ اس قدر محبت اور شفقت کے بعد بھی تنہائی کے لمحات اسے جانے کیسے سوالوں سے دوچار کر چکے تھے۔ اس کے ذاتی معاملات کو ان الفاظ نے جو سوالات دیے وہ مسرور ... کے دروازے سے بے دھڑک ہو نکلنے لگا۔

۞ ۞ ۞

ڈاکٹر صاحب کے کیس نے اسے آج بری طرح تھکا دیا تھا۔ آج اس نے کورٹ میں گواہ پیش کیے تھے۔ شروع شروع میں اسے یہ کیس بہت آسان لگا تھا۔ لیکن جوں جوں کیس آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچیدگی آتی جا رہی تھی۔ پہلے جو نتائج مثبت دکھائی دے رہے تھے اب نہیں۔ کچھ الٹ ہی اثر ہو رہا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح ریسٹ کر بھی نہیں پایا تھا کہ ماں کا بلاوا آ گیا۔ اسے یکدم سے یاد آ گیا تھا۔ آج کمال الدین کے بیٹے کی شادی تھی۔ ماں نے اسے وہاں جانے کا حکم سننے سے پہلے ہی جاری کر دیا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ان کے پاس آیا تو وہ تیار ہو رہی تھیں۔ وہ لان میں انتظار کرنے کا کہہ کر لان میں چلا گیا۔ کمال الدین اس کے والد کے بچپن کے دوست تھے۔ وہ ایک کاروباری آدمی تھے۔ شہر میں ان کے جنرل اسٹورز تھے۔ ان کا کاروبار گو کہ بہت بڑے پیمانے پر نہیں تھا۔ بہرحال وہ ایک کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لوگ ان کی کالونی میں گئے۔ جہاں ایک گھنٹے کا سفر ہوتے تھے یہ مسافت تھی۔ وہ لان میں ٹہل رہا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کے پیچھے تو کیا عجب سا تھا۔ سورج کی نارنجی شعاعیں ابھی تک آسمان پر تھیں۔ ہر طرف ایک نگاہ ڈال کر کچھ پل کو آنکھیں بند کر کے شام کی خوب صورتی کو محسوس کرنے لگا۔ ماں کی آواز پر یکدم اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔
"چلیں۔" اس کی ماں نے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے مڑ کر ماں کو دیکھا پھر گاڑی کی جانب چل پڑا۔ کچھ دیر بعد گاڑی مین روڈ پر دوڑ رہی تھی۔
"کتنے بجے تک واپسی ہو گی؟" وہ ماں سے مخاطب تھا۔
"میں کچھ دیر ہی رکوں گی۔ آپ مجھے لینے آ جانا۔" ماں نے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی۔ گاڑی کالونی میں ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے رکی۔ کالونی میں ایک ہنگامہ سا مچا ہوا تھا۔ ڈیک کے تیز شور سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس بچے بڑے خوش باش ادھر ادھر گھومتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔
کمال الدین بڑے پرتپاک انداز میں ان کی جانب آئے۔
"آج تو خوب صورت گھڑی آئی ہے کہ عثمان کو اپنے

ہو آئے۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔ خاندان کی شادیوں میں وہ کبھی کبھار ہی شرکت کرتا تھا۔ وہ بھی ماں کی شدید ناراضگی پر۔ وہ کمال الدین کے ہمراہ مردانہ حصے میں چلا گیا جبکہ کلثوم اندر چلی گئیں۔ صدیقہ نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگاتے ہوئے گلہ کیا تھا کہ وہ رات کو مہندی کی رسم پر کیوں نہیں آئی تھیں۔ جس پر انہوں نے اپنی بیماری کا بتا کر اس کا گلہ رفع کیا۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد چلا گیا۔

وہ کھانا پلیٹ میں لیے ایک کونے میں کھڑی تھیں۔ ان کی نظریں بجائے اپنی پلیٹ کے ایک دوسری ٹیبل سے کچھ ہٹ کر کھڑی لڑکی پر جمی تھیں۔ جس شوق سے انہوں نے اپنی پسندیدہ ڈش پلیٹ میں ڈالی تھی اب اتنی ہی بے دلی سے اسے کھا رہی تھیں۔ وجہ وہ سامنے کھڑی لڑکی تھی۔ لڑکی نے سادہ سے سلک کا سوٹ پہنا تھا۔ اس پر سلک کا ہم رنگ دوپٹہ اس کی قمیص کی ڈھنگ غضب کی تھی یا لڑکی اتنی ہی۔ وہ سوچ رہی تھیں اس لڑکی کا حسن آنکھوں کو خیرہ کرنے والا تھا۔ ان کی نظریں بے اختیار اس کے پاؤں پر جمی تھیں اس کے پاؤں میں سے جیکن اونچے گاؤں کے ہوتے تھے۔ وہ بہت سادہ اور معصوم سی لگ رہی تھی۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھیں جب صدیقہ ان کے پاس آئیں۔

"کچھ بھی کچھ لیا ہے کہ نہیں۔" ان کی حلاوت بھری آواز پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں لے چکی ہوں۔" پھر نظریں بدستور اس لڑکی پر جمائے انہوں نے یکدم سے صدیقہ سے پوچھا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" انہوں نے اشارہ کیا تھا۔

"یہ۔" جوابا صدیقہ نے بھی اشارہ کر کے جوابا پوچھا تھا۔ "ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس کے باپ نے یہاں گھر لیا ہے۔" صدیقہ نے تفصیلاً بتایا تھا۔

"اس کا باپ کیا کرتا ہے؟" اب بھی ان کی نظریں اسی کے چہرے پر تھیں جن اس لڑکی میں مقناطیسی کشش تھی جو نظروں کو ہٹنے نہ دینے پر مجبور کرتی تھیں۔

"دکاندار ہے۔ کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے اس کی۔"

"جی اچھا اچھا۔" ان کے اچھا اچھا میں تقویت جھلکتی نظر آئی تھی۔

"تم کیوں پوچھ رہی تھیں؟" کچھ لمحے بعد صدیقہ نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی پوچھا تھا۔" اس کے بعد انہوں نے اس لڑکی کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ انسان کے تحت اس کے غرور و غرور پر تقدیر بھی مسکرایا کرتی ہے کہ انسان کی کم عقلی اور بے وقوفی پر سوائے مسکرانے کے اس کے پاس کوئی دوسرا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ عقل کہتی ہے کہ میں ٹھیک کام کر رہی ہوتی ہوں۔ لیکن جب تقدیر مجھ پر آتی ہے تو میرا کام کاٹ دیتی ہے۔ انہیں کچھ نہیں پتہ تھا کہ تقدیر بنانے والے نے ان کی تقدیر میں کیا لکھ دیا تھا۔

✿ ✿ ✿

سرسبز پہاڑوں میں گھری زیارت کے نشیب میں ایک گہری ندیا بہتی تھی۔ اطراف میں سرسبز درخت تھے۔ ایک خاموش بیابان لیکن ایک حسین اور دلآویز علاقہ تھا۔ وہ دونوں پانی کے کنارے پتھروں پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت اس خاموش فضا میں چڑیوں کی چہچہاہٹ تھی۔ سنہری دھوپ پہاڑوں پر پھیل رہی تھی۔ ہلکی ٹھنڈی سرد ہوا چل رہی تھی۔ وہ ہڈیوں تک کو جما رہی تھی۔ آسمان پر تاروں کی چادر بھی نظر آ رہی تھی۔ سورج غائب تھا۔ ندیا پر سکون تھی۔ سارا ماحول پر سکون تھا۔ وہاں بیٹھے افراد بھی پر سکون تھے۔ سکون سے بے سکونی تک ہے۔ بے پناہ سکون کسی اندیشے کا پیغام ہوتا ہے۔ جو انسان کے علم میں نہیں ہوتا۔ وہ دونوں اپنے کل سے بے خبر آج میں ہی رہ رہے تھے۔

جنجر کے پانچ لمحے وہ اپنی حسین آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے بول رہی تھی۔

"جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تو یکدم سے دل میں کیسی ہلچل سی ہوئی تھی۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ پہلی بار تمہیں دیکھتے ہی میرا دل تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس رات مجھے نیند بالکل نہیں آئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تم سے ابھی اسی پل ملوں۔ صبح تک کا انتظار بھی نہ کروں۔ پھر دوسری رات تمہیں دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ بیچ سڑک میں خوشی سے چلانے لگوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے محسن جن سے محبت ہوتی تو اس قدر شدید کیوں ہونے لگتی ہے کہ انسان کو ایسا بنا دیتی ہے اسے اس کے وجود سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اپنی روح الگ کر اس سے اس کی روح چھین لیتی ہے۔" بولتے بولتے یکدم سے اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی اور اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر سر جھکا کر سوچنے لگا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی خاموشی طاری رہی تھی۔ جسے ایک بار پھر اس کی آواز نے توڑا تھا۔

"محسن کیا تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی شدید محبت ہے جتنی کہ مجھے تم سے؟" اس پل اس کی آواز میں سنجیدگی تھی یا تشویش وہ جان نہ پایا تھا۔

"بولو نا کیا تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے؟" اب کی بار اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو اس وقت میں یہاں تمہارے ساتھ موجود نہ ہوتا۔ تمہیں محسن سے محبت ہے پر محسن کو تم سے عشق ہے۔" اس نے دھیرے سے اس کی گھنی زلفوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ نمناک لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا سر اپنے شانے سے لگایا تھا۔

زندگی کی کیا مسلے سے انسان اتنا ہی بے خبر ہوتا ہے جتنا کہ اس کی زندگی اگر خبر ہوتی ہے تو صرف تقدیر کو تقدیر خاموش تماشائی بنی صرف کھیل دیکھتی ہے۔ جہاں اس کی انٹری ہوتی ہے۔ وہاں انٹر ہو کر دونوں کھلاڑیوں (زندگی "انسان") سے بال چھین کر انہیں ہرایا کرتی ہے۔ تقدیر کیا رخ بدلتی ہے تقدیر زندگی اور انسان کو کیا اس طرح بدلتی ہے۔ اس سے سب لاعلم ہوتے ہیں۔ اس سے ہونے والی ہر ملاقات محبت میں اضافہ کر رہی تھی۔ زندگی انعم سے شروع ہو کر ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس میں تحسین بھی تھی۔ وہ جو بھی فکر کرتا تھا۔ انعم اب بھی یاد آتی تھی۔ لیکن تحسین کے محبت بھرے لہجے نے اس بار دل کو راکھ کر دیا تھا۔ محبت ایک بار نہیں ہوتی۔ محبت بار بار بھی ہوتی ہے۔ وہ خود کو قائل کرتا تھا۔ یا پھر وہ ہی محبت کے معاملے اس انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا۔

اس نے سنا تھا کہ انسان کو اس کی اولین محبت کبھی بھی نہیں بھولتی۔ اگر بھول جاتی ہے تو وہ محبت ہی نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا۔ کیا اس کی پہلی محبت محبت نہیں تھی یا احساس تھا یا کہ محبت کے بارے میں پڑھا جانے والا فلسفہ ہی غلط تھا۔ بہرحال اس نئی محبت میں وہ سرشار زندگی کو ایک بار پھر نئے سرے سے انجوائے کر رہا تھا۔

فون کر کے اس نے اسے انگیر مارکیٹ بلایا تھا۔ مارکیٹ کے سامنے وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ وہ اکتا کر گاڑی سے نکل آیا تھا۔ مارکیٹ کے باہر کی سیڑھیوں پر ٹہل ٹہل کر وہ شدید کوفت میں مبتلا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر ٹہلتے رہنے کے بعد وہ سیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔ دونوں گھٹنوں پر بازو رکھے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے وہ سامنے سڑک میں کھڑے پھولوں کے ہار بیچنے والے لڑکے کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔

"صاحب لو گے آپ دس روپے کا ہے۔ صاحب بالکل تازہ ہے۔ دیکھو کیا خوشبو ہے۔" وہ خوشامد و منت بھری آواز میں کہتا اسے خریدنے پر اکسا رہا تھا۔

"دے دو۔" اس نے جیب سے روپے نکال کر دس کا نوٹ اسے تھما کر ہار لے لیا تھا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا تھا۔ ہاتھوں میں ہار لیے وہ اس شوز شاپ کی طرف مڑ کر بلا ارادہ نظریں دوڑانے پر یونہی سرسری سا دیکھنے لگا تھا۔ کچھ پل بعد وہ رخ موڑ کر سیڑھی سے

اترنے لگا تھا۔ لیکن تیسری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ بے ساختگی کے انداز میں دو سیڑھیاں چھوڑ کر تیسری سیڑھی پر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں تحیر آمیز ہو گئی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑے پھولوں کے ہار پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ اندر کوئی جل اٹھا تھا۔ دل اندر محبت جاگ اٹھی تھی۔ وہ شاید اپنی موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔ سامنے کھڑی لڑکی بھی اپنی جگہ جم کر کھڑی تھی۔ لیکن وہ دوسرے ہی پل اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر چل پڑی تھی۔ وہ جیسے ہوش میں آیا تھا۔ یکدم سے اس کی جانب بڑھا تھا۔

"انعم پلیز بات سنو میری۔" اس نے اسے بے ساختہ پکارا تھا۔ اس کی بات پر وہ مڑے۔ اس نے قہر آلود آواز میں کہا تھا۔

"انعم پلیز۔"

"پلیز انعم تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ دو منٹ رک کر میری بات تو سن لو۔" وہ منت بھرے لہجے میں کہتا ہوا اس کے قدم سے قدم ملاتے چلا جا رہا تھا۔

"مجھے نہیں سننی تمہاری بات۔ تمہارے درد بھرے جملے تمہارے ہارے ہوئے الفاظ۔ نفرت ہے مجھے تمہاری مجبوری سے نفرت ہے مجھے تم سے۔ اب کبھی بھی میری راہ میں مت آنا۔" وہ سرد چٹانی لہجے میں بولی ایک پل کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کے پاس سے گزر گئی تھی۔ وہ پتھر کا بنا کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ آندھی تھی یا طوفان، وہ زلزلہ تھی یا قہر پل میں سب کچھ بھسم کر کے چلی گئی۔ پل بھر کے لیے آئی اور کیسے دیرپا اثرات چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس بچھڑے دل کو قرار کیوں نہیں آیا تھا ابھی تک۔ وہ دکھی ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے شدید غصہ آیا تھا۔

"ہیلو سوری تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ دراصل گاڑی خراب تھی۔ اس لیے مجھے بھائی کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔" وہ فرنیش سی لڑکی معذرت کر رہی تھی۔ اس نے اس کی معذرت نہیں سنی تھی۔ اس نے تو اس کی بات بھی نہیں سنی تھی۔ اس نے جو آواز سنی تھی اس کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"نفرت ہے مجھے تمہاری مجبوری سے۔"

"ہاں نفرت تھی اسے اپنی مجبوری سے۔" وہ خود سے بولا تھا۔ "اس کی خطا نہیں ہے نفرت کرنی چاہیے اسے۔" وہ خود سے کہہ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں ادھر ادھر دیکھ کر اس کے اترے رنگ کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ اس کے ہاتھ میں پھولوں کے ہار کو دیکھ کر یکدم سے مسرت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"میرے لیے لیا ہے۔" اس نے لینے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ چونک اٹھا تھا۔

"یہ کسی سے گر گیا تھا۔ یونہی دیکھنے کی خاطر اٹھایا تھا میں نے۔ میں کسی کی چیز نہیں لیتا۔ اس لیے اسے پھینک رہا ہوں۔" کہتے ہی اس نے ہاتھ آخری سیڑھی کی طرف اچھالا تھا۔

"میں گھر جا رہا ہوں۔" اس نے سپاٹ آواز میں کہا تھا۔

"کیا شاپنگ نہیں کرو گے؟" اس نے حیرانگی سے کہا تھا۔

"نہیں۔ میری طبیعت خراب ہے۔" دو ٹوک جواب دے کر اس نے اسے مزید سوالات سے گویا روک دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے گاڑی کی طرف جاتے دیکھتے ہوئے اس کا انداز جانچنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

گھر آ کر وہ بستر پر دراز انہی الجھی سوچوں میں کھویا تصور ہی میں اس سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں موجود ہر چیز کو آگ لگا دے۔ خوبصورت کمرے میں مکمل اندھیرا کیے وہ بستر پر اوندھا لیٹا تھا۔ کمرے کے سناٹے کو دروازے کی آہٹ نے چیر ڈالا تھا۔ کھلنے پر اس نے سر اٹھا کر دروازے کی جانب گردن اونچی کر کے دیکھا تو آنے والے اس کے والد تھے۔

"کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے؟" وہ پاس آ کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آواز پر وہ پہلے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے آواز میں بیگانگی سموتے ہوئے سپاٹ انداز میں کہا تھا۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"میں غلام نبی سے کہہ دیتا ہوں کہ تمہارے لیے گرم سوپ لے آئے۔ ساتھ میں پیناڈول بھی۔ ایک ٹیبلٹ میں اس کے ہاتھ بھجوا دیتا ہوں۔ وہ لے لینا۔ اس سے بہت جلد طبیعت بحال ہو جائے گی۔" ان کی فکرمندی پر دل نجانے کیوں سخت سا ہوا تھا۔ وہی تو تھے مجرم اس طبیعت کی خرابی کے۔ وہ اندر ہی اندر سلگنے لگا تھا۔ وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ملازم سوپ ساتھ میں بریڈ اور ٹیبلٹ لے آیا تھا۔

"تم جاؤ میں سوپ پی لوں گا۔" اس رات وہ کہیں نہیں تھا صرف انعم تھی۔ جو اس کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ کون کہتا ہے کہ محبت شہد سے میٹھی ہے۔ محبت تو وجود کو نیست و نابود کر دینے والا مہلک زہر ہے۔ ساری رات پریشان کن سوچیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اگلے دو دن تک اس پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اس سے اگلے دن نگین سے ہونے والی ملاقات نے وجود پر چھائی اس افسردگی اور سنجیدگی کو بالکل ختم کر دیا۔

اسٹڈی روم میں بیٹھا وہ ضروری فائلیں دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کمپیوٹر پر انڈیکس بھی چیک کر رہا تھا۔ کچھ فائلیں نمٹا کر وہ اٹھ کر ایک فائل لیے اپنے کمرے میں آیا۔ وہ ایک بہت ضروری کیس کی فائل تھی۔ جسے آج اسٹڈی کرنا انتہائی ضروری تھا۔ اس کیس کا فیصلہ چند دنوں میں ہونے والا تھا۔ کیس انتہائی پیچیدہ تھا۔ ایک عورت کے نکاح پر نکاح کا کیس تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا اس فائل کو بڑے غور سے پڑھ رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھول کر فاروق اندر آیا تھا۔

"ارے تم ابھی تک سر کھپا رہے ہو۔ چلو یار کچھ آؤٹنگ کر لیں۔ بے کار کی فائلیں لیے بیٹھے ہو۔" اس نے فائل جھٹکا کر بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"کب آئے تم؟" اس نے فائل پھر سے اپنے سامنے کرتے ہوئے اسی مصروف انداز میں کہا تھا۔

"ابھی ہی آیا ہوں۔ خالہ جان نہیں ہے گھر پر سیدھا تمہارے روم میں آ گیا۔ بس بھی کرو یار کیا بدتمیزی ہے۔" اس سے مزید صبر نہ ہو سکا تھا یکدم سے اس کے ہاتھ میں سے فائل کھینچ کر بیڈ پر پھینک دی تھی۔ اس نے بھی ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔ فائل قدرے پرے کھسکا کر وہ کہنے لگا۔

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"یار کوئی فلم ولم دیکھ لیں گے۔ تھوڑی ڈرائیو شاپنگ کر لیں گے۔"

"پر میں نے سات بجے کا وقت تو نگین کو دیا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے معذرتی انداز میں کہا تھا۔

"اچھا یوں کرتے ہیں کہ اسے بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ تینوں ساتھ چلیں گے۔" اس کے مشورے پر تشکر لہجے میں کتنا خوش ہو کر بولا تھا۔

"ٹھیک ہے میں کپڑے چینج کر کے آتا ہوں تم تب تک ٹی وی سے دل بہلاؤ۔" ریموٹ اس کی جانب پھینک کر وہ باتھ روم چلا گیا تھا۔ جبکہ وہ بے فکری سے بستر پر دراز ہو کر ٹی وی پر چینل بدلنے لگا۔ اپنے سب کزنز میں اس کی سب سے زیادہ دوستی فاروق سے ہی تھی۔ فاروق اس کی نگین سے ہونے والی ہر ملاقات سے آگاہ تھا۔ اس کے تیار ہونے کے بعد وہ دونوں نگین کی طرف گئے تھے۔ فاروق نے پہلی بار نگین کو دیکھا تھا۔ وہ اسے اچھی لگی۔ اس نے کھلے دل سے اس کی تعریف بھی کر ڈالی۔ وہ حقیقی معنوں میں اس سے انسپائر ہوا تھا۔ اسے لڑکیوں میں حد درجہ خود اعتمادی بہت بھاتی۔ اس دن ان تینوں نے مل کر خوب آؤٹنگ کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نگین کو دوسری ہی صبح واپس جانا تھا۔ وہ دو دن کی چھٹی پر گھر آئی تھی۔ اس دن انہیں بہت مزہ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نگین نے آج رات نو بجے واک پہ نکلنے کا اس سے

کمرہ رکھا تھا۔ مقررہ وقت پر وہ گھر سے نکلا تھا۔ گھڑی پر ایک نگاہ ڈال کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ چند منٹ کی واک کے بعد وہ مقررہ مقام پر پہنچ کر الیکٹرک پول کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ لیکن اسے طویل انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ اسے دور سے آتی دکھائی دی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ نزدیک آ کر پھولی سانسوں سمیت بولی تھی۔

"زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر وہ دونوں دھیرے دھیرے چل پڑے تھے۔

یونہی باتوں کے دوران پارک کے گرد چکر لگا کر وہ مین روڈ پر آ گئے تھے۔ مذہب کہتا ہے کہ ایک غیر مرد اور عورت کے درمیان ایک شیطان موجود ہوتا ہے۔ حد سے زیادہ بے تکلفی شیطانی کوشش ہے۔ شیطان کی حد سے زیادہ بے تکلفی کی صورت یا رنگ لانے لگتی ہے۔ حد سے زیادہ بے تکلفی انسان کی آنکھ سے حیا اور اس کے وجود سے شرم کھینچ نکالتی ہے اور انسان کو شیطان کے زیر اثر لا کھڑا کرتی ہے۔ جہاں اس کے ورغلانے پر انسان لمحہ دو لمحے ہی سہی عمل کرنے لگتا ہے۔ شیطانی چال کامیاب ہو جاتی ہے۔ انسان بے تکلفی کے جوش میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے ڈوب کر رہ جاتا ہے اور وہ بھی ڈوبنے لگے تھے۔

"تمہارا فائنل ایئر کب ہو گا کہ میں اس کے مکمل ہوتے ہی تمہیں بیاہ کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔" وہ دونوں دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ دریا کی روانی میں ایک ٹھہراؤ سا نظر آ رہا تھا۔ دریا بہہ رہا تھا۔ لیکن بہتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کتنا سناٹا ہے یہاں۔" وہ کنارے کھڑے درخت کی اوٹ سے دریا کو جھانک کر پھر سے اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"مجھے تنہائی اچھی لگتی ہے اور پھر جب تم ساتھ ہو تو اور بھی زیادہ۔" وہ اس سے لگ کے چل رہی تھی۔ بولنے کے معاملے میں وہ بڑی بے باک تھی جو بھی بات دل میں ہوتی تھی فوراً بول دیتی تھی۔ وہ جھک کر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا تھا۔

"ہم ہوسٹل کی لڑکیاں ایک ہفتے کے ٹور پر شمالی علاقہ جات جا رہے ہیں۔ میں کچھ دنوں کے لیے تم سے نہیں مل پاؤں گی۔ میرا دل بہت اداس ہے۔ انکار میں یوں بھی نہیں کر سکتی کہ میری فرینڈز مجھ سے خفا ہو رہی ہیں۔ اب ان سب کو بھی ناراض نہیں کر سکتی۔" پھر ایک دم سے وہ چونکتے ہوئے کسی پرخیال انداز میں کہنے لگی تھی۔

"تم کیوں نہیں چلتے ہمارے ساتھ؟" اس کی آواز ایکدم سے انبساط سے پر ہو گئی تھی۔

"میں۔" وہ قدرے تیز آواز میں بولا تھا۔

"ہاں تم۔" پھر کچھ رک کر بولی تھی۔ "وہ پہنچیں گے لیے تم بھی چلو نا۔ گھر میں کوئی سا بھی بہانہ بنا کر چلے چلو۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے مسلسل جانے پر اکسا رہی تھی۔ وہ کسی خیال میں کھویا سوچ رہا تھا۔ کسی حتمی فیصلے پر پہنچتے ہی اس نے جانے کی حامی بھری تھی۔ وہ بہت خوش ہو گئی۔

"دو دن بعد ہم جا رہے ہیں۔ تم بھی اسی دن کا موبائل ساتھ رکھنا کچھ نمبر سیو کر لینا کہ ہم کہاں مل سکتے ہیں۔" مسکراتے ہوئے اس نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

رات کو کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔ اس وقت جمال کے کچھ گیت گاتے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ مصروف تھے۔ کلثوم نماز پڑھنے کے بعد سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

"آؤ کوئی بات ہے کیا؟" اسے قریب جگہ دیتے ہوئے انہوں نے ملائمت بھری آواز میں کہا۔ وہ ان کے قریب بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے باندھ کر کچھ کہنے کو الفاظ ترتیب دینے لگا۔

(دوسرا اور آخری حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نادیہ امین

طلب عشق

مکمل ناول

"امی کچھ دوست شمالی علاقہ جات جا رہے ہیں۔ میں بھی جانا چاہتا ہوں ایک ہفتے کے لیے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ مبالغے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

"ہاں تو پوچھنے کی کیا بات ہے۔ تم بس جانے کی تیاری کرو۔ اچھا ہے گھوم پھر لو گے تو فریش ہو جاؤ گے۔"

"آپ پپا سے کہہ دیں گی نا۔" وہ خاص الجھن کو رفع کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں میں ان سے بات کرلوں گی۔ بس تم اپنی تیاری کرو۔" کچھ ثانیے تامل کرکے بولی تھیں۔ "جاؤ گے کب؟"

"پرسوں۔" اس کے مختصر جواب پر بولی تھیں۔

"اپنا دل خوش کرو اللہ تمہارا مددگار ہے۔" رات کو ہی انہوں نے شوہر سے بات کرلی تھی۔

"ہاں چلا جائے۔ کچھ تفریح ہو جائے گی ویسے بھی کافی عرصے سے ان دفتری معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ باہر گھوم پھر کر کچھ فریش ہو جائے گا۔"

ایک دن بعد اسے روانہ ہونا تھا۔ اس نے مکمل تیاری کرلی تھی۔ تیاری وہ اپنی تباہی کی کر رہا تھا۔ جس کا علم اسے نہیں تھا۔ وہ لڑکی اپنی بربادی کو دعوت دے چکی تھی۔ ان کے آگے ایک کٹھن سی زندگی کھڑی ان کا والہانہ استقبال کر رہی تھی۔

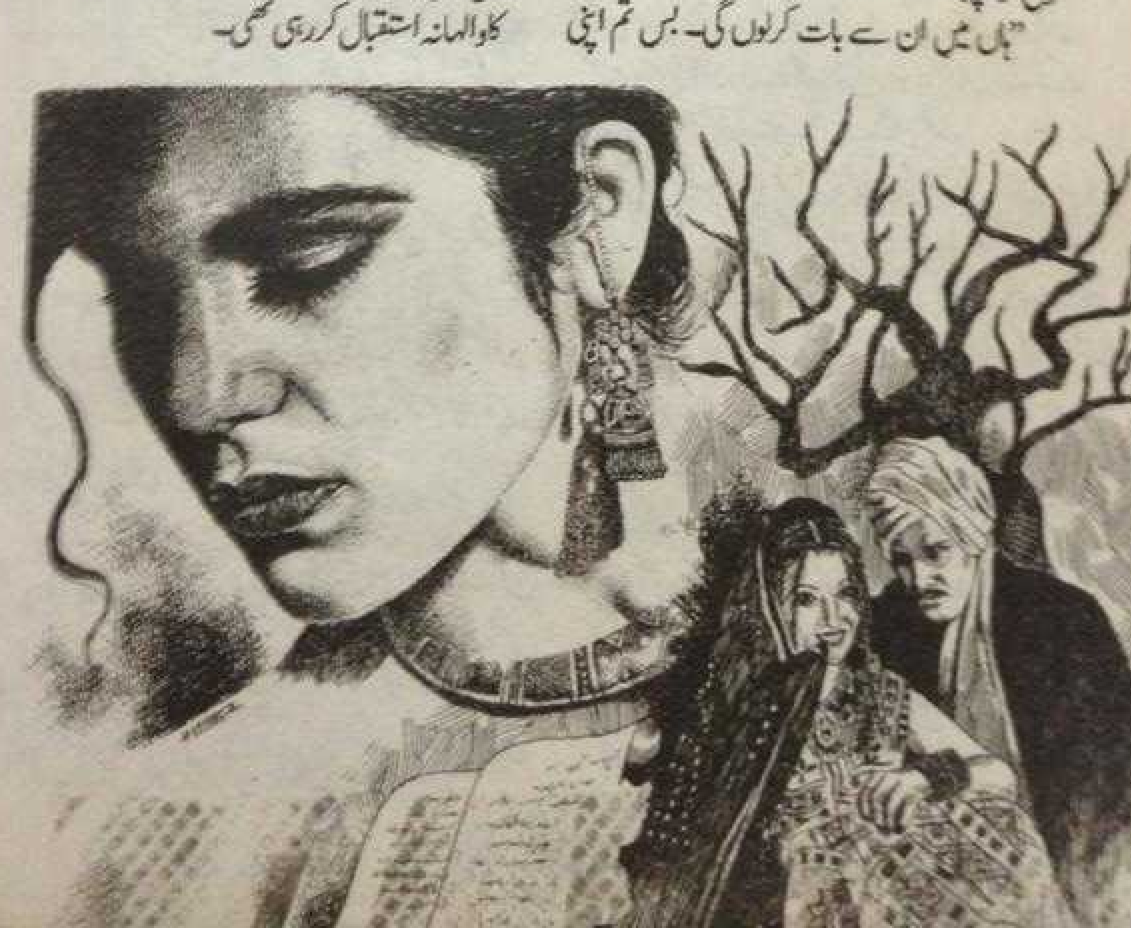

۲

دوسرا اور آخری حصہ

ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرا کر وہ بے تابی سے تمکین کی طرف سے رابطے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے آئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اب تک اسے رابطہ کر لینا چاہیے تھا۔ جو کہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا بے کلیانہ انداز میں ریسٹ واچ پر نگاہیں ڈال رہا تھا۔ ہاتھ میں تھما موبائل بھی خاموش تھا۔ اس کے موبائل کے نمبرز بار بار پش کرنے کے باوجود اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

تمکین کا فون آ گیا۔

"ہاں تو محترمہ جی آپ کہاں ہیں؟" اس کی آواز سن کر اس نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ "اب آیا میرا خیال پچھلے ساڑھے تین گھنٹوں سے میں یہاں جھک مار رہا ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"اچھا ہوٹل کا نام بتاؤ میں آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی میں کہا تھا۔

"نہیں میں آ رہا ہوں تم مجھے ایڈریس دو۔"

ایڈریس لکھوا کر وہ ٹیکسی والے کو مقررہ مقام کا نام بتا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک خوش کن ملاقات کا تصور اسے بے پناہ خوش کیے جا رہا تھا۔ یہ خوشی کسی قسم کی قید ذمہ داریوں، پابندیوں، مسئلے مسائل سے مبرا تھی۔ جہاں اسے ہونا تھا اور تمکین کو، جہاں محبت کو ہونا تھا اور عشق کو۔ عشق کہاں ہے۔ جواں مرد اور عورت میں۔ عشق ملاقات میں۔ عشق ملاقات سے مبرا ہے۔ عشق روحانی ہے۔ مادی نہیں۔ وہاں طلب تھی۔ عشق نہیں۔ یعنی اس مرد کو عشق نہیں تھا۔ طلب تھی۔ اسے عشق نہیں تھا اسے اس بات کی آگاہی نہیں تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

دور سے ہی وہ اسے پی سی او کے باہر کھڑی نظر آئی تھی۔ پی سی او ریسٹورنٹ کے دائیں جانب تھا۔ یہی مقام انہوں نے مقرر کیا تھا۔ اس وقت وہ بلیک جینز اور بلیک شرٹ میں نظر آئی تھی۔ اس کے یہ اٹھتے قدم اسے آگ سے جلانے جا رہے تھے۔ آگ اور برف بہت متضاد چیزیں ہیں۔ وہ برف خود کو آگ میں جھونکنے جا رہی تھی۔ اس برف کو پگھل کر لاوا "آگ" بننا تھا۔ اور وہ آگ کی صورت اختیار کرتے جا رہی تھی۔ اور آگ ہمیشہ جان لیا کرتی ہے جان و زندگی دیا نہیں کرتی۔

☆☆☆

سب لڑکیاں شاپنگ کے لیے جا رہی تھیں۔ اپنی فرینڈز کو بتا کر وہ اس کے ساتھ ایک پرسکون سی جگہ پر آئی تھی۔ اس حسین جنگل بیابان میں اونچے اونچے درخت اور چار سو خاموشی تھی۔ یہ میدانی علاقہ نہیں تھا۔ پہاڑی تھا۔ سرخ مٹی کے پہاڑ بارش کے بعد مزید گہری سرخی اختیار کر چکے تھے۔ پودے، گھاس پھوس درخت نکھر چکے تھے۔ جنگلی پودوں کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اکا دکا اور دور کچھ مکانات نظر آ رہے تھے۔ اس پتھریلے علاقے میں ہر طرف سبزہ نظر آ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودے جڑی بوٹیاں سرسبز و شادابی لیے ہوئے تھے۔ یونہی گھومتے پھرتے وہ نشیب میں اتر گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی ندیا بہہ رہی تھی۔ لکڑی کا پل دونوں کناروں کو آپس میں ملانے کا باعث تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر پل پر آیا تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ڈری سہمی آواز میں بولی تھی۔ وہ مسکرا کر مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے اسے کھینچتے ہوئے تیز چل پڑا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ نہیں گرو گی۔" اس نے تسلی دی تھی۔ پل ہل رہا تھا۔ اور اس کے خوف کو بڑھا رہا تھا۔ یک دم سے وہ دوڑنے کے انداز میں اسے کھینچتے ہوئے دوڑانے لگا تھا۔ وہ چلانے لگی تھی۔ وہ بے تحاشا چلا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے اختیار دوڑ رہی تھی۔ یک دم سے وہ رک گئی تھی۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں تو وہ اسے بہت کھل کر مسکراتا ہوا دکھائی دیا تھا۔

"بچوں کی طرح ڈر رہی تھیں دیکھو کچھ ہوا۔" بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ جبکہ وہ

ناراض ہو کر ندی کے کنارے پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"میرے ساتھ آؤ گی تو اتنا تو سہو گی۔" پھر دل کھول کر مسکرانے لگا تھا۔
"مر جاؤں نا تب بھی اسی طرح ہنسنا۔" وہ ہنوز مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
"تب تو قہقہے لگاؤں گا۔" وہ رخ پھیر کر بیٹھ گئی تو وہ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے معذرت کرنے لگا تھا۔
"چلو اٹھو نا۔ معاف بھی کر دو۔ اچھا آؤ میں تمہارے لیے گرم گرم کباب لوں۔ کھاؤ گی تو دعا دو گی بڑے مزے کے ہیں کچھ آگے جا کر ملیں گے۔" وہ اسے للچا رہا تھا۔
"مجھے پتا ہے میں دیکھ چکی ہوں اور کھا چکی ہوں۔" وہ ناراض سی اٹھ گئی تھی۔
"تمہیدی کیسے کھانے کے لیے چل پڑیں۔" وہ اسے چھیڑنے کو بولا۔ وہ مڑ کر زوردار دھکے کی صورت اس کو جواب دے چکی تھی۔ گہرے کالے بادل پھرے آسمان کے اطراف کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ رعد و باراں کی اس طوفانی کیفیت کا اندازہ ہوتے ہی انہوں نے جانے کا سوچا۔
"اس سے پہلے بارش یہاں مقید کر دے ہمیں چلنا چاہیے۔" اس نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے۔ ندیا سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ یخ ہوا چلنے لگی تھی۔
ان کی واپسی تک بارش شدت اختیار کر چکی تھی۔ وہ بروقت آنے پر شکر ادا کرتے رہے تھے۔ لڑکیاں شاپنگ کر کے واپس آ چکی تھیں۔ ہما نے اسے لتاڑتے ہوئے کہا تھا۔
"اگر تم چلی چلتیں تو بڑا مزہ آتا۔ اتنی ورائٹی اتنی ورائٹی کہ کیا بتاؤں۔ دل چاہتا تھا سارے ڈیکوریشن پیسز میں ہی خرید لوں۔" وہ ان کی شاپنگ کو بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ اور ان پر ریمارکس پاس کرنے لگی۔ اگلے دو دن مسلسل بارش ہوتی رہی۔ اس قدر

خواتین ڈائجسٹ
میں قسط وار چھپنے والا
عمیرہ احمد
کا خوبصورت ناول
ایمان امید اور محبت
شائع ہو گیا ہے
خوبصورت سرورق اعلیٰ چھپائی
آفسٹ پیپر مضبوط جلد
قیمت ۱۸۰ روپے
ڈاک خرچ ۳۰ روپے
کتاب منگوانے کے لئے
۲۱۰ روپے کا پیشگی ڈرافٹ یا
منی آرڈر ارسال فرمائیں
دستی خریدنے یا ڈاک کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
۳۷- اردو بازار کراچی
فون: ۲۲۱۶۳۶۱

طوفانی بارش میں وہ سب کمروں میں بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ تیسرے دن موسم کچھ بہتر ہوا تھا۔ دوپہر تک پھر سے گھنے سیاہ بادل سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ اس پر اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ یہاں آنے کی خوشی پر جیسے اوس سی پڑ گئی تھی۔ آج مسلسل تیسرا دن تھا ان کی ملاقات ہوئے۔ برق و باراں نے ساری دلچسپی کو گویا ملیامیٹ کر دیا تھا۔ اس کا خیال اسے کہاں سے کہاں لے گیا۔ اکتاہٹ اور جھلاہٹ سی سارے وجود پر چھا گئی تھی۔ وہ رنج والم کی تصویر بنی ملن کی ترکیب سوچنے لگی۔ کوئی صورت واضح نہ ہو رہی تھی۔ عجیب سی بے بسی سارے وجود کو گھیر چکی تھی۔ موبائل پر بھی بات نہ ہو سکتی تھی کہ ہر وقت لڑکیاں کمرے میں موجود ہوتی تھیں۔ تنہائی کا کوئی لمحہ ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ کوفت سے کمرے میں ٹہلتے وہ آسمان پر چھائے بادلوں کو کھڑکی سے بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں آسمان صاف ہونے، بارش نہ ہونے اور اپنے ملن کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ جو بے چینی دل و دماغ پر حاوی تھی۔ وہ ملاقات سے ہی چھٹ سکتی تھی۔

اس نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر بارش کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ باہر ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے محرابی ہونٹوں کے گوشوں پر پھیل گئی تھی۔ متلاطم جذبات ٹھہرے گئے تھے۔ ایک سکون آمیز سی راحت سارے جسم میں پھیل گئی تھی۔ اپنی کیفیت پر وہ خود ہی مسکرا اٹھی تھی۔ دوپہر کو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تھیں۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکی وہ سب دھیمی دھیمی آوازوں میں مسلسل بول رہی تھیں۔ زارا فل والیوم سے ٹیپ ریکارڈر لگائے محبت بھرے گیت سن رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھی زری اسے کھینچ کھینچ کر اپنے دل پسند گیت کو پلے کرنے کی التجا کر رہی تھی۔ جس کا مطلق اثر نہ ہو رہا تھا۔ کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر وہ جھلاہٹ سے اٹھ کر یمی اور راحت کے پاس چلی گئی تھی۔ جو کسی ڈرامے کے کلائمکس کو بڑے انہماک سے ڈسکس کر رہی تھیں۔ اپنے بستر میں دبکی وہ اسے ہی سوچے جا رہی تھی۔ اس کی سوچ کا محور وہی تھا۔ کچھ دیر بعد بلا ارادہ اس کی نظریں کھڑکی کے شیشوں پر پڑی تھیں۔ شیشوں سے چھن چھن کرتی دھوپ اندر کمرے کی نیم تاریکی کو قدرے روشن کر چکی تھی۔ وہ سرعت سے بستر چھوڑتی اٹھی تھی۔ اور کھڑکی کے قریب آ کر باہر کے موسم کا جائزہ لینے لگی تھی۔ اکا دکا بادل نظر آ رہے تھے۔ کھری دھوپ نکل آئی تھی۔ مسرت بھری لہر سارے جسم کو چھو گئی تھی۔ وہ مڑ کر ان سب سے کہنے لگی۔

"دھوپ نکل آئی ہے۔ بارش رک گئی ہے کیا خیال ہے؟ باہر نہ گھوما پھرا جائے۔"

"ارے واقعی دھوپ تو نکل آئی ہے۔" گڈمڈ آوازیں ابھریں اور کچھ پل بعد وہ سب کھڑکی سے جھانک کر موسم کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ کچھ پل بعد وہ سب وارڈن کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ کچھ دیر کی پس و پیش کے بعد انہیں باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ ہما مہوش کے پاس آئی۔ "میں عثمان سے ملنے جانا چاہتی ہوں۔ پچھلے تین دن سے اس سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہوا۔ تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ شاپنگ کا بہانہ کر کے۔ تم لوگ آؤٹنگ وغیرہ کر لینا میں بعد میں خود ہی آجاؤں گی۔" اس نے وضاحت سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"جلدی آؤں گی۔ وہ پریشان ہو رہا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا۔" وہ پانچوں کی پانچوں نکلی تھیں، اسے اس کے راستے چھوڑ کر وہ لوگ گھومنے پھرنے چلی گئی تھیں جبکہ وہ ہوٹل آئی تھی۔ اس کے کمرے کے ڈور پر اس نے ہلکی سی دستک دی تھی۔ کچھ انتظار کے بعد اس نے دروازے کو کھولنا چاہا تھا۔ وہ آنکھوں میں استعجاب لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم اس وقت کیسے؟" اس نے استعجابیہ لہجہ میں سوال کرتے ہوئے اسے اندر آنے کی جگہ دی تھی۔

"آ گئے ہم۔" اس نے شان تفاخر سے فرضی کالر کھڑے کرتے ہوئے جواباً کہا تھا۔

”صبح سے الگ تھلگ کمرے میں بیٹھا خاصا بور ہو چکا ہوں۔“ اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی بے تکلفی سے وہیں بیٹھ گیا تھا۔ اسے بیٹھتا دیکھ کر وہ بھی بیٹھ گئی تھی۔

”اور سناؤ۔ اتنے دن یاد کیا مجھے؟“ اس کی آنکھوں میں وارفتگی دیکھ کر اس کے دلکش لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس کے سوالیہ انداز پر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا ہے۔ جبھی تو یہاں آئی ہوں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے چائے منگوائی۔ چائے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد پھر سے گھٹاٹوپ اندھیرا محسوس ہوا تھا۔ وہ اٹھی اور کھڑکی کے پاس گئی تھی۔ پردہ سرکا کر جائزہ لیا تو گہرے کالے بادل نظر آئے تھے۔ موٹے موٹے قطرے برس رہے تھے۔ وہ برستی بارش کے حسین منظر کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش نے اسے اداس کر دیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی مسلسل برستی بارش سے۔ لیکن اب وہی برستی بارش آنکھوں کو دل کو بہت بھا رہی تھی۔ وجہ وہ پاس بیٹھا لڑکا تھا۔ وہ بھی اس کے نزدیک آکھڑا ہوا تھا۔ باہر بادلوں کی گرج نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ بارش سے متعلق نظم سنانے لگا تھا۔ وہ مدہوش سی سن رہی تھی۔ اور بارش کو محویت سے تکے جا رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھیں بارش کے حسین منظر سے اور بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھیں۔ اثر بارش کا تھا یا اس کی آنکھیں ہی حسین تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبنے لگا تھا۔

”بارش کتنی بڑی نعمت ہے نا۔ پیاسی دھرتی کو سیراب کر دیتی ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں سادگی سے بولی تھی۔

”اور آنکھیں بھی۔“ اس کا لہجہ اس کی آواز خود بخود دھیما ہو گیا تھا۔ تیز ہوا کا جھونکا آیا تھا۔ اس کے بالوں کی لٹوں کو لہرا گیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر دونوں ہاتھ اس نے سینے پر باندھ دیے تھے۔ اس وقت وہ اس ماحول سے لاتعلق ہو گئی تھی حتیٰ کہ پاس کھڑے مرد سے بھی۔ لیکن وہ مرد اس سے ایک پل کے لیے بھی لاتعلق نہیں ہوا تھا۔ اس تعلق کو اور زیادہ گہرا کرنے کے لیے وہ اس کے کندھے پر اپنا چہرا ٹکا کر اپنے بازو اس کے گرد باندھ رہا تھا۔ ایک پل کو مکمل سناٹا سا چھایا محسوس ہوا تھا۔ مزاحمت کا تصور جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ تب ”عشق“ میں ڈوبنے کا مدہوش کن لمحہ وہاں موجود دو نفوس کو مدہوش کر گیا تھا۔ وہ اس کی محبت تھا۔ اس لیے جو محبت وہ دے رہا تھا۔ اس کی وصولی غلط نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سوچنے کا عمل محبت پانے کا عمل بن چکا تھا۔ وہاں وہ عورت نہیں رہی تھی۔ وہاں وہ عزت نہیں رہی تھی۔ وہاں وہ ایک پیاسا صحرا بن گئی تھی۔ جسے سیراب کرنے کو ایک آوارہ بادل راہ بھٹکتا آ رہا تھا۔

✻ ✻ ✻

وہ جب سے آئی تھی۔ چپ چپ تھی۔ اس کی چپ کو اس کی دوستوں نے محسوس کر لیا تھا۔ لیکن پوچھنے کی جسارت اس لیے بھی نہ کر پائی تھیں کہ وہ خود سے کچھ بتا دے گی۔ کوئی ڈر کوئی خوف سا دل و دماغ پر بسیرا کر دیتا تھا۔ جس پر وہ خود کو دلاسے دینے لگتی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں خطا صرف اس مرد کی تھی۔ کہ وہ بھی اس میں برابر کی شریک تھی۔ اس لیے وہ اسے الزام نہ دے سکتی تھی۔ وہ وہاں سے پانچ بجے واپس آئی تھی۔ اس کی دوستوں کے سوال پر اس نے دیر سے آنے کی یہی وجہ بتائی تھی کہ بارش نے گھیر لیا تھا۔ اسے عثمان پر بھروسا تھا۔ اس نے اسے بہت دلاسے بہت تسلیاں دی تھیں۔ اپنے ”سچے“ پیار کا یقین دلایا تھا۔ ”سچا“ پیار کہاں ہوتا ہے۔ کہاں ملتا ہے۔ سچا پیار بے غرض ہوتا ہے۔ وہاں غرض تھی۔ وہاں پیار نہیں تھا۔ وہ بار بار معذرت کرتا رہا تھا۔ وہ سسک گیا تھا۔ وہ ہر سزا کے لیے تیار تھا۔ اس وقت وہ یہ بھول رہا تھا کہ جزا و سزا کا اختیار، جزا و سزا دینے والی ذات رب کریم کی ہے۔ جو سزا دیتا ہے وہ صرف اس انسان کے لیے نہیں

سارے زمانے کے لیے عبرت بن جاتی ہے۔ وہ بھی عبرت بننے جارہے تھے۔ وہ وہاں جس جوش و خروش سے گئی تھی۔ اتنی ہی اداس اور گم صم چلی آئی تھی۔

اس سنگین حادثے کے تیسرے ہی دن وہ لوگ واپس آگئے تھے۔ اسے اپنے والدین کا خوف تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دل میں اسی بات کی تکرار جاری تھی۔ عثمان کے بار بار یقین دلانے کے باوجود کچھ گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس کی بے پناہ تسلی تشفیوں نے شانت کر دیا تھا۔ اور پھر وہ اپنے دماغ سے سارے "فضول اور پریشان کن" خیالات ترک کر کے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اس نے جلد ہی رشتہ بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہاں سے واپسی کے بعد وہ فوراً" ماں سے بات نہیں کر سکا تھا۔ اس دوران پندرہ دن بیت چلے تھے۔ آج اور کل "کل اور آج میں دن بیت رہے تھے۔ وہ بار بار بات کرنے کا دباؤ ڈال رہی تھی۔ رات کو ہی اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا بات کرنے کا۔ صبح آفس میں وہ ضروری کام نمٹا رہا تھا کہ فون کی بیل بجی تھی۔ دوسری طرف ملازم تھا۔

"صاحب جی مرزا صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ آپ فوراً" پہنچو اور بڑے صاحب سے بھی کہہ دو۔" اسے شاکڈ لگا تھا۔ اس کے خالو انتقال کر گئے تھے وہ خالہ کی طرف چلا گیا تھا۔ سوئم تک وہ وہیں رہا تھا۔ جبکہ ماں کو چالیسویں تک رکنا تھا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد اس کی ملاقات نگین سے ہوئی تھی۔ جس میں اس نے اسے اپنے خالو کی وفات کا ذکر کیا تھا۔ وہ انتظار کی سولی پر لٹک رہی تھی۔ دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ چالیسواں ہو گیا تھا۔ انہیں شمالی علاقہ جات سے آئے کافی عرصہ بیت چلا تھا۔ رات کو کھانا کھاتے ہی وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔ وہ ٹی وی پر مووی دیکھ رہا تھا جب اسے موبائل پر کال وصول ہوئی تھی۔ دوسری طرف نگین تھی۔

"عثمان تم۔" دوسری طرف سنجیدہ آواز میں پوچھا گیا تھا جس کے جواب میں فرط مسرت سے اسے تنگ کرنے کی خاطر "کون عثمان" کہہ کر اسے گویا تنگ کر کے لطف اندوز ہونا چاہا تھا۔ لیکن سنجیدگی اس وقت اختیار ہوئی تھی جب دوسری طرف سنجیدگی سے "میری بات غور سے سنو" کہہ کر اسے حقیقتاً" سنجیدہ کر گئی تھی۔ اور بنا اس کی کوئی بات سنے وہ کہنے لگی تھی۔

"تم اگر پہلے سیریس نہیں تھے تو اب ہو جاؤ۔ کیونکہ اب تمہیں سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ بہلاوے مت دو مجھے۔ سیدھی طرح سے اپنے ماں باپ کو ہمارے گھر بھیجو اس سے پہلے کہ۔۔۔۔" کچھ رک کر وہ پھر سے بولی تھی۔ "میں پریگننٹ ہوں آج رپورٹ آگئی ہے۔ اس بات سے ہمارے گھر میں کیا کہرام آچکا ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ عثمان اب تمہیں ہر حال میں اپنے ماں باپ کو ہمارے گھر بھیجنا پڑے گا۔ مجھ پر جو قیامت بیت رہی ہے۔ اس کی سزا میں اکیلے نہیں سہوں گی۔" وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی تھی جسے سننے کی سکت اس میں نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ سو فیصد مخلص تھا۔ وہ اسے دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حواس سلب کرنے والی اور ہولناک خبر اس کے پریگننٹ ہونے کی تھی۔ وہ بالکل گم صم سی کیفیت میں اس کی حد سے زیادہ سنجیدہ اور سخت آواز کو سن رہا تھا۔

"تمہارے گھر والوں سے کس نے کہا ہے؟" اس کے لبوں سے بمشکل الفاظ برآمد ہوئے تھے۔

"میں نے۔" اس نے مختصر کہا تھا۔

"کیوں بتایا تم نے اس سے معاملہ بگڑ بھی۔۔۔۔"

"معاملہ نہ بتانے سے بگڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنی ماں کو بتایا اس لیے کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسی کے ذریعے میرے باپ کو پتا چلا۔ وہ مجھ پر کتنے بگڑے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم۔ اب ہر حال میں تمہارا رشتہ چاہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے اندر اندر۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکے تو وہ تمہارے ماں باپ سے بات کرنے خود آئیں گے۔" وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ رو

پڑی تھی۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں۔ میں اپنے والدین کو جلد ہی بجھواؤں گا۔ میں آپ ہی ان سے بات کرتا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اپنے ماں باپ کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم سن رہی ہو نا۔" اس نے نڈھال آواز میں کہا تھا۔

"ہاں۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اسے ہر طرح سے مطمئن کر دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ بہت پریشان ہوا تھا۔ اس جذباتی لمحے کی قید میں آ کر وہ کیا کر بیٹھا تھا۔ حقیقی معنوں میں اب اندازہ ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہاں ایسا یقین بمشکل ہی آتا ہے۔ انسان گناہ کرتا ہے تو یہ بھول جاتا ہے کہ اس گناہ کا ظہور بھی ہو گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ قیامت کے دن ہی عیاں ہو گا۔ وہ یہ بھول بیٹھا ہوتا ہے کہ قیامت سے پہلے بھی قیامت آیا کرتی ہے۔ جو دین و دنیا دونوں میں خوار کر دیتی ہے۔ احساس کی طنابیں وجود کو جکڑے چین نہ لینے دے رہی تھیں۔ وہ پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ سخت پیاس محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کچن میں چلا آیا تھا۔ پانی پی کر وہ اپنے کمرے میں واپس آنے کے بجائے اوپر چھت پر چلا گیا تھا۔ اوپر ٹھنڈی ہوا گرم حواس کو ٹھنڈا نہ کر سکی تھی۔ آسمان پر لکیریں جمائے وہ آنے والے حالات پر غور کرنے لگا تھا۔ اوپر کی گرل پر ہاتھ جما کر اس نے نیچے جھانکا تھا۔ مالی بابا چوکیدار کے پاس بیٹھا بڑے جوش و خروش سے بول رہا تھا۔ چوکیدار بیزار سا نظر آ رہا تھا۔ اسے اس کی باتیں سننے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ کبھی دائیں طرف دیکھتا کبھی بائیں جانب۔ مالی بابا بہت باتونی تھا۔ اسی اثنا میں اس کی نظریں لان میں آتی ماں پر پڑی تھیں۔ اسی وقت اس نے ملازم کو چائے لاتا دیکھا تھا۔ چائے رکھ کر وہ چلا گیا تھا۔ اس وقت لان میں وہ تنہا بیٹھی ہوئی تھیں۔ مالی بابا اور چوکیدار گیٹ کے قریب بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ اس وقت بات کرنے کا بہترین موقع تھا۔ یہی سوچ کر وہ سرعت سے مڑ کر زینے طے کر کے باہر لان میں چلا آیا تھا۔ اگلے تین منٹ میں وہ ماں کے سامنے تھا۔

"جب سے سیر کر کے آئے ہو تمہاری رنگت ہی نکھر گئی ہے۔ گھوما پھرا کرو کہ یہی دن ہیں بے فکری کے۔ اس کے بعد تو بندہ بالکل پھنس کر رہ جاتا ہے۔ پھر تو بس یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔" وہ چائے کے سپ لیتی کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی ہتھیلی کھولے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اس پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماں کی بات اس کے سر پر سے گزر گئی تھی۔

"امی آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ اپنے اندر ہمت مجتمع کرنے لگا تھا۔

"ہاں کہو۔" عام سے انداز میں کہتی ایک نظر گیٹ سے باہر نکلتے مالی بابا پر ڈالی تھی۔

"مجھے نگین پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔" بات کا آغاز اسے خود بڑا عجیب لگا تھا۔ اس نے دیکھا تھا اس کی ماں کے تاثرات پل بھر کے لیے بدل گئے تھے۔ پھر اپنے تاثرات کو حتی المقدور چھپاتے ہوئے انہوں نے بڑے نرم انداز میں کہا تھا۔

"پھر میں تو ضویا کے لیے تمہاری خالہ سے کہہ چکی ہوں۔ تمہارے پپا بھی خاندان میں ہی رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔" ان کے خاموش ہونے پر وہ بولا تھا۔

"میں ضویا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے نگین پسند ہے۔ آپ وہاں جائیں۔" اس کے لہجے میں پھر بغاوت کی بو آ رہی تھی۔

"باپ کیا کرتا ہے؟" وہ کچھ نرمی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی تھیں۔

"شوگر مل ہے ان کی۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر کچھ پل کی خاموشی کے بعد بولی تھیں۔

"ٹھیک ہے تمہارے پپا سے بات کرتی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔" ماں کے الفاظ پر کچھ امید

پسند بھی تھی۔ رات کو ہی انہوں نے جمال سے بات کی تھی۔

"اگر اسے پسند ہے تو ٹھیک ہے پہلے پتہ تو کر لیں گے لوگ کیسے ہیں۔ مل اونر تو بہت ہوتے ہیں کچھ عزت بھی ہے بھی کہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ غلط لوگوں میں پھنس جائیں۔ اور ابھی بہت سی باتوں کو دیکھنا ہے۔ اب منہ اٹھا کے تو بیٹی نہیں مانگ سکتے۔ میں کل نبیل سے کہہ دیتا ہوں وہ ان کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے لگے۔ تب بات کرنے چلے چلیں گے۔"

بات کلثوم کے دل کو بھی لگی تھی۔ انہوں نے بھی تائید کی تھی۔ محسن کو پتا چلا تو وہ بھی خوش ہوا تھا۔ اطمینان اس بات کا تھا کہ اس کے باپ نے صاف انکار نہیں کیا تھا۔ وہ نیند سے بیدار ہوا تو ملازم پیغام لے کر آیا تھا۔

"بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" وہ شکن آلود لباس ہی میں ہاتھ منہ دھوئے ان کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں تھے۔

"بیٹھو۔" باپ کی آواز پر اس نے سامنے والے صوفے کا انتخاب کیا تھا۔

"دیکھو بیٹا اگر مجھے اپنا باپ سمجھتے ہو۔ اگر مجھ پر یقین کرتے ہو تو تمہیں میری باتوں پر یقین اور عمل کرنا پڑے گا۔ یہ رشتہ جس کا ذکر تم نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ میں اس پر رضامند تھا بشرطیکہ لوگ اچھے ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے معلومات حاصل کیں۔ اور جو معلومات مجھے ملیں وہ یہ ہیں کہ وہ لڑکی حد سے زیادہ بے باک اور آزاد ہے۔ اس کی کئی لڑکوں کے ساتھ افیئر چلے ہیں۔ بات صرف لڑکی تک محدود نہیں ہے۔ اس کی ماں کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے۔ تم خود سوچو اس قسم کے لوگوں میں رشتے داری اچھی لگے گی۔ کل کو تمہارے بچے ہوں گے ان کی تربیت ان کے مستقبل پر یہ باتیں بہت اثر انداز ہوں گی۔ ایسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا بھی بڑا برا سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر رشتہ داری جوڑنا تو۔ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ لوگ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ جو ان جیسے لوگوں کے ساتھ رشتہ جوڑا۔ اس کے والد کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں۔ ایسے خاندان کے ساتھ کیسے رشتہ جوڑا جا سکتا ہے کہ پورا کا پورا خاندان ہی۔ بیٹا شہرت اچھائی کی اچھی لگتی ہے برائی کی نہیں۔ اس لیے میں تم سے یہی کہوں گا کہ اس رشتے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ وہ لڑکی اور وہ خاندان تمہارے قابل نہیں ہے۔" یہ شخص دوسری بار اس سے اس کی زندگی چھین رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ مدافعانہ و ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے مزید بولے تھے۔

"یہ سب میں تمہارے بہتر مستقبل کو مد نظر رکھ کر ہی کہہ رہا ہوں ورنہ تو۔۔۔"

اس نے بھی مدافعانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "پپا وہ ایسی نہیں ہے۔ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ کچھ لوگ حسد کے مارے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور بس۔"

"بیٹا حسد کی بنا پر ایک شخص بہتان لگا سکتا ہے دو لگا سکتے ہیں تین' سارے کے سارے نہیں۔ آگ جلتی ہے تو دھواں اٹھتا ہے۔ جھوٹ سچ کبھی چھپتا نہیں ہے۔ وہ خود بخود عیاں ہوتا ہے۔ کوئی تمہاری ماں کے بارے میں غلط کہے۔ جلتے تو بہت سے ہم سے بھی ہیں۔ پر جو بات ہم میں نہیں ہے نہیں ہے۔ کوئی ایسا بہتان لگا ہی نہیں سکتا کہ ماننے والا کوئی نہیں۔ جھوٹ نہیں چھپتا۔" وہ بڑے مدلل انداز میں اسے سمجھا رہے تھے۔

"پپا مجھے یہی پسند ہے۔ میں اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔" اس نے دوٹوک انداز میں اختیار کیا تھا۔

"تم جہاں چاہو۔ جس لڑکی پر ہاتھ رکھنا چاہو وہ تمہاری ہوگی بشرطیکہ لوگ عزت والے ہوں۔ خاندانی ہوں۔ ایسے نہیں۔" وہ اب بھی ملائمت سے کہہ رہے تھے۔ "پر میں اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بضد تھا۔

"اپنی پسند بدلو۔" باپ نے اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔

"وہ لڑکی ہے کپڑے نہیں جسے بدلوں۔" اس کے

لہجے میں تلخی کی بو آئی تھی۔

"ٹھنڈے دماغ سے سوچو تمہیں میری باتیں حقیقت پر مبنی لگیں گی۔" باپ کا لہجہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو اٹھا۔

"سو بات کی ایک بات میں اسی سے شادی کروں گا اور وہ بھی ایک مہینے کے اندر اندر۔ ارجنٹ۔" اس کا انداز حتمی تھا۔ اس کی بات پر باپ کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ ماتھے کی رگیں تن گئی تھیں۔ ایک خاموش نظر اپنی بیوی پر ڈال کر وہ پھر سے اس کی جانب دیکھنے لگے تھے۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" باپ کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔ انہوں نے اسے شرمندہ کرنا چاہا تھا۔

"آپ ان کے گھر جائیں ارجنٹ۔" وہ شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ تو میں نہیں کر سکتا۔ کوئی اور حکم؟" اب کی بار بڑے سخت لہجہ میں کہا گیا تھا۔

"جب مجھے پسند ہے جب میں خاندان پر اعتراض نہیں کر رہا تو آپ لوگ کیوں؟" اس کی بات کاٹ کر وہ درشت آواز میں بولے تھے۔

"تم اس لیے اعتراض نہیں کر رہے۔ کیونکہ تمہاری آنکھوں پر عشق کی پٹی بندھی ہے۔ اور ہم اس لیے معترض ہیں کیونکہ ہم ایسے کسی بھی مرض سے دوچار نہیں ہیں۔" باپ کے حتمی فیصلے کی بو پاتے ہی اس نے عاجزانہ لہجے میں فوراً کہا تھا۔

"بابا پلیز ایسا نہیں کریں گے آپ۔ آپ لوگوں کو جانا پڑے گا وہاں۔"

"اگر وہ تمہارے قابل ہوتی تو میں ضرور جاتا۔ تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔ بس یہی کہنا ہے مجھے۔" اس نے بڑے آس بھرے انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بالکل خاموش تماشائی بنی اپنا سر جھکا گئی تھیں۔ وہ اٹھ گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ پلٹ کر بولا تھا۔

"تو آپ لوگ بھی میری بات سن لیں۔ اگر میری شادی تمکین سے نہیں ہوئی تو میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا۔ کبھی بھی نہیں۔" اس کی وارننگ پر کلثوم تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ابھی بیٹے کے چہرے سے حیرت جھلک رہی تھی۔ کچھ دن تک ماحول میں تناؤ کی کیفیت چھائی رہی تھی۔ وہ باپ کے راضی ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور ماں باپ اس کی تسلیاں دکھانے لگا۔ دوسری جانب وہ مسلسل تمکین کو تسلیاں دے رہا تھا۔ کچھ دن بعد اسے تمکین کی ماں کی کال موصول ہوئی تھی۔ انہوں نے نہایت سخت لہجے میں اس سے بہت کچھ کہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو جلد ہی راضی کر کے ان کے گھر بھیج دے گا۔ اتوار کی صبح ناشتے کی میز پر اس نے وہ موضوع پھر سے چھیڑ دیا تھا۔

"میں جو کہہ چکا ہوں وہی حرف آخر ہے۔ یہ تم مت بھولو۔ میں اپنے خاندان میں بٹے کے ڈھیر نہیں لگانا چاہتا۔" وہ بڑے فیصلے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"آپ لوگوں کو کیا تکلیف ہے؟ جب میں ہی اعتراض نہیں کر رہا۔ مجھے وہی پسند ہے۔ چاہے جیسی بھی ہے۔ ساری دنیا اسے غلط کہے میرے لیے وہ سب سے بڑھ کر اور بالکل صحیح ہے۔" اس کا غصہ بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

ناشتہ ٹیبل پر یونہی دھرا تھا۔ وہاں وہ ناشتہ کرنے آئے تھے بھول بیٹھے تھے اس کی ماں نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا جس پر انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"تم چپ رہو۔ تمہارے لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے اسے۔" شوہر کے غصے کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔

"تو بھاگ جاؤ تم دونوں۔ یا پھر کورٹ میرج کر لو۔ یہاں اس کی بارات نہیں آ سکتی۔ جو بدنامی اسے یہاں لانے پر ہوگی اس سے بڑھ کر کیوں نہ ہو۔ وہ کارنامہ انجام دو کہ جس کی تعریف ایک زمانہ کرے۔ مدتوں اپنے خاندان کا نام روشن رکھو۔ اتنی معمولی بدنامی سے کیا ہوگا۔ وہ کرو کہ تمہارے سارے خاندان میں کسی نے نہ کیا ہو۔" وہ بہت برہم تھے۔

"تمہارا باپ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگر تم ہمیں اپنا ماں باپ سمجھتے ہو تو ہماری بات ماننی پڑے گی۔ ورنہ

چلے جاؤ اسی کے ساتھ۔" ان دونوں کے صاف انکار پر وہ شکستہ لہجے میں بولا تھا۔

"آپ لوگ نہیں جائیں گے۔"

"نہیں۔۔۔" اس کا باپ چٹانی آواز میں بولا تھا۔

"تو سنیے۔ آپ لوگوں کو بدنامی سے بچانے کے لیے ہی میں نے ان کے گھر جا کر پروپوزل دینے کا کہا تھا۔ اس میں آپ سب کی اور میری عزت ہے۔ کیونکہ وہ میرے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔" اس کی بات پر سامنے بیٹھے وجود بالکل پتھر بن چکے تھے۔ سارے جسم کی طاقت و توانائی نچڑ گئی تھی۔ شاید جسم سانس لینا حرکت کرنا بھول بیٹھا تھا۔ وہاں جامد خاموشی تھی۔ مہیب سناٹا تھا۔ سوچنے اور کچھ بھی بولنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

"اگر آپ بدنامی سے ڈرتے ہیں تو جو میں کہہ رہا ہوں وہی کریں۔ میں بالکل صاف اور سچی بات کہہ رہا ہوں۔ کل کو اگر ان لوگوں نے یہ بات ہر جگہ پھیلا دی تو اس میں آپ کی بدنامی سمیت ساری عزت ہی نیلام ہو جائے گی۔ صاف صاف بات یہی ہے۔ جس کی وجہ سے میں شادی اور جلدی پر زور دے رہا ہوں۔ سارا قصور میرا ہے۔ اس لڑکی کا نہیں۔ وہ لوگ شریف ہیں جواب تک کوئی حتمی کارروائی نہیں کر بیٹھے۔ ورنہ۔۔۔۔ اب میں آپ سے کہوں گا کہ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تاکہ ہمارا سفر عزت سے بے عزتی کی طرف نہ ہو۔" وہ کرسی دھکیل کر ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔ اور ڈائننگ ہال سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ دونوں پتھر کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ پتھر سوچ نہیں سکتے۔ پر وہ دونوں اپنی اپنی دھن میں مگن سوچ ضرور رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ایسے گندے لوگوں میں رشتے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر کیا خبر کس کا گناہ میرے بیٹے کے سر تھوپ رہی ہو۔ ایسی لڑکیوں کا کسی ایک سے تعلق نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں کر سکتے وہ لوگ۔ اگر کریں گے تو اس میں ان کی بدنامی ہو گی۔ اپنی بدنامی کے خوف سے بھی کچھ نہیں کریں گے۔ میں ایسا گندا خون اپنے خاندان میں نہیں لا سکتا۔ اور وہ ہمارا بے وقوف احمق بیٹا۔ اسے یہ تک نہیں معلوم کہ ایسی لڑکیوں کا شوہر کوئی نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد بھی کبھی ایک کا ہاتھ تھامے چل پڑتی ہیں اور کبھی دوسرے کا۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ وہ بے وقوف۔۔۔ کچھ نہیں کر سکتے وہ لوگ۔ کچھ دن چیخیں گے چلائیں گے اور پھر خود ہی چپ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ تم بھی ایسے نالائق بیٹے کی باتوں میں مت آنا۔ میں ایسے گندے خاندان میں ایسی بچ عورت کے ساتھ اس کا رشتہ کسی بھی قیمت پر نہیں جوڑ سکتا۔ نیور۔" وہ خود بھی اپنے شوہر کے حق میں تھیں۔ محاذ قائم تھا۔ جیت کس کی ہونی تھی۔ اس کی خبر صرف تقدیر بنانے والے کو تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ ذہنی دباؤ کے باعث آفس میں بھی صحیح کام نہ ہو پا رہا تھا۔ سارا کام انہوں نے نبیل پر ہی ڈالا ہوا تھا۔ ایک اولاد تھی۔ اس نے بھی وہ ذہنی چرکے دینا شروع کیے تھے کہ اولاد کے نام سے ہی متنفر ہو گئے تھے۔

والدین کے صاف انکار پر اس نے شدید رویہ اختیار کیا تھا۔ ان کے ساتھ بولنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے نگین کو حالات کی سنگینی کے بارے میں صاف صاف بتا دیا تھا۔ وہ بہت برہم ہوئی تھی۔ شوریدہ سر خیالات ذہنی خلفشار کو بڑھا رہے تھے۔ جانے کیوں اپنی ہزیمت کا یقین ہو چلا تھا۔ وہ مخمصے میں پھنسا عجیب واہمہ کا شکار تھا۔ شاید اس کی قسمت میں ایک آسودہ زندگی لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ وہ سوچتا رہتا تھا۔ اس کا مسموم ذہن کچھ کر گزرنے کی سوچتا رہتا تھا۔ لیکن اس سوچ پر عمل پیرا ہونا بڑا مشکل امر تھا۔

ماں باپ کے ساتھ بات چیت بند تھی۔ وہ بھی شاید اسے بھول گئے تھے۔ انہوں نے بھی پہل نہیں کی تھی۔ ذہن پر چھائی تیرگی انتشار کو بڑھا رہی تھی۔ اس انتشار پر قابو اس صورت ہی پا سکتا تھا جب کانوں میں اس کی میٹھی رسیلی آواز پڑے۔ چنانچہ اس نے اس کا سیل فون نمبر پش کیا تھا۔ پریشان کن خیالات طبیعت

کو بوجھل بنا رہے تھے۔ ان سے چھٹکارا لازمی تھا۔

"ہیلو۔ نگین۔" اس کے فون اٹھانے پر وہ بے صبری سے بولا تھا۔

"کہو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں مختصر جواب دیا تھا۔

"نگین، پلیز۔ ایسا ہی ہو مت کرو۔ تم بھی ایسا کرو گی تو میرا کیا ہو گا۔" عجز و انکساری سے کہتا وہ گویا دکھ کی آخری سیڑھی پر تھا۔

"عثمان ایک بات صاف صاف کہوں کہ مجھے مجبوریوں سے نفرت ہے۔ اگر تم مجبور تھے اتنے لاچار انسان تھے تو ایسے مجبور لاچار انسان کو کبھی محبت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ کورٹ میرج پر نہ تم تیار ہو نہ میرے ماں باپ۔ شادی پر نہ تمہارے ماں باپ تیار ہیں نہ تم۔"

"پلیز نگین تم میرا نام کیوں لے رہی ہو۔ کیا تم اس بات پر یقین کرتی ہو کہ میں جان بوجھ کر تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔" اس نے درد بھری آواز میں کہا تھا۔

"تمہارے دکھ کو میں سمجھتی ہوں۔ میرے دکھ کو تم کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے۔" اس نے بہت ٹوٹے شکستہ لہجے میں کہا تھا۔

"ایک بات سن لو عثمان۔ اگر ایسا نہیں ہوا جو میں چاہتی ہوں تو یہ بھی یاد رکھو کہ تمہارے ساتھ بھی کبھی اچھا نہیں ہو گا۔ میرا دل دکھا کر تمہیں کبھی بھی خوشی نہیں مل سکتی۔ اب سنو۔ میں ابارشن کروا رہی ہوں۔ اس بچے کے قاتل بھی تم کردانے جاؤ گے۔ اور میں۔۔۔" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"اور میں تو ہوں ہی۔ کہ یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ایک آخری بات کہنا چاہتی ہوں۔ کہ اس سب کے باوجود میں آج بھی تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔" کھٹاک سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ وہ ساکت وجود لیے خاموش گم صم بیٹھا ریسیور کو تکے جا رہا تھا۔ ایسا کیوں کیا اس نے۔ اس قدر ہولناک باتیں کیونکر کیں اس نے۔

وہ پچھلی کچھ راتوں سے مسلسل نیند کی گولیاں لے رہا تھا۔ نیند اس سے روٹھ چکی تھی۔ اور وہ نیند سے۔ اس وقت بھی وہ دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے باندھے بستر پر دراز خیالات میں ڈوبا اپنے ساتھ رونما ہونے والے واقعات کو یکے بعد دیگرے سوچے جا رہا تھا۔ سوچ کا تسلسل موبائل کی بیپ سے ٹوٹا تھا۔ چونک کر اس نے ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھایا تھا۔ نمبر نگین کے گھر کا تھا۔ وہ استعجاب میں پڑ گیا تھا۔ رات کے اس پہر کیونکر فون کیا تھا۔

"ہیلو عثمان بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف نگین کی ماں تھی۔ بے اختیار اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی اپنی رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھا تھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وہ شدید حیران ہوا تھا۔ اس وقت کیا بات ہو سکتی تھی۔ بات کی شروعات جس طرح ہوئی تھیں اس نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

"اب پڑ گیا تمہارے دل میں چین۔ تم ہی قاتل ہو میری بیٹی کے۔ تم نے مارا ہے اسے۔ اب مناؤ تم سب خوشیاں۔ کہ مر گئی وہ۔ تمہاری وجہ سے مر گئی وہ۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ابارشن اس کی جان لے لے گا۔ تم کیوں نہ مر گئے۔ کس حال میں مر گئی وہ۔" وہ رو رو کر اسے بد دعائیں کوسنے دینے لگی تھیں۔ جبکہ وہ پتھر کی صورت بنا بیٹھا تھا۔ نگین مر گئی اسے یقین نہیں آیا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کیسے مر گئی اتنی جلدی یہ مذاق کر رہی ہیں۔" وہ سوچ رہا تھا۔

"لیکن مذاق کیوں کر رہی ہیں؟ نہیں وہ مذاق نہیں کر رہی وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن اتنی جلدی مر گئی۔ ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہاں ہو سکتا ہے۔ تو نگین مر گئی۔" وہ بے خیالی میں موبائل کو تکے جا رہا تھا۔ پھر اس نے موبائل رکھ دیا تھا۔ اور اٹھ کر سلیپرز پہننے لگا تھا۔ وہ کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھیں گیلی تھیں۔ اس نے چہرے پر نمکین قطرے محسوس کیے تھے۔ اپنی آستین سے آنکھیں رگڑ کر وہ بڑی عجلت سے ماں کے کمرے کی

جانب بڑھا تھا۔ اس نے بڑے زور کی دستک دی تھی۔ کچھ ہی پل بعد دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ کلثوم حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ماں کے گلے لگ کر رونے لگا تھا۔ وہ حیرت سے دوچار اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی تھیں۔ جمال بھی دستک کی آواز پر جاگ گئے تھے۔ وہ بھی بیٹے کی اس عجیب وغریب کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ بیٹے کے آنسو اپنی بدنصیبی پر بہہ رہے تھے۔ وہ اس کی جانب بڑھے تھے۔ وہ مرد تھے انہیں اپنے اعصاب پر قابو حاصل تھا۔ تبھی اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر وہ پوچھنے لگے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟ رو کیوں رہے ہو؟'' وہ اور بھی شدت سے رونے لگا تھا۔ ایک نظر انہوں نے اپنی بیوی پر ڈالی تھی۔ وہ بھی بے تحاشا روئے چلی جارہی تھیں نظریں پھیر کر ایک بار پھر سے اس سے پوچھنے لگے۔ ''تم سے پوچھ رہا ہوں؟'' اسے یونہی روتا دیکھ کر انہوں نے اسے اس کی ماں سے الگ کیا تھا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ کی جانب لے آئے تھے۔ اور اسے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے پلانے لگے تھے۔

''نہیں پینا مجھے پانی۔ زہر دے دیں مجھے۔ آپ لوگوں نے میری محبت ہی نہیں چھینی میری زندگی بھی چھین لی۔ کیسا رشتہ چاہیے آپ لوگوں کو۔ نہ آپ کو غریب کی غریبی پسند ہے نہ امیر کی امیری۔ کہ غریب کی عزت غریبی کی وجہ سے نہیں۔ اور امیر کی عزت امیری کے باعث نہیں۔ کہاں ہے عزت' محبت سوچ سمجھ کر نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں سمجھتے آپ لوگ۔'' وہ چلایا تھا۔

''مار ڈالا آپ لوگوں نے اسے۔ مر گئی وہ۔ خوش ہو جائیں آپ۔ یہاں مار ڈالا آپ نے مجھے۔ میری ہر حسرت کو پورا کر کے ایک حسرت کی ضد کے باعث مار ڈالا آپ نے مجھے۔ یہاں مر جاؤں گا میں۔'' باپ نے ہاتھ میں تھما گلاس ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اور پھر بے اختیار انہ اسے گلے لگایا تھا۔ وہ تیز آواز میں رونے لگا تھا۔

''مت ہو۔'' باپ نے تنا ڈالا تھا۔ فکر کی گہری پرچھائیاں ان کے چہرے پر عیاں تھیں۔ کافی دیر بعد نشہ آور ٹیبلٹ کھلا کر اسے اپنے کمرے میں سونے دیا تھا۔ اس کے ماں باپ باقی ساری رات جاگتے رہے تھے۔

۞ ۞ ۞

صبح وہ دیر سے جاگا تھا۔ اسے پورے جسم میں سخت حرارت محسوس ہوئی تھی۔ سارا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ اپنے اوپر پڑے کمبل کو اس نے کھینچ کر پرے پھینکا تھا۔ اور بستر سے اتر گیا تھا۔ تیز قدموں سے وہ کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا تھا۔ جلدی سے کپڑے تبدیل کیے تھے۔ گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر آیا تھا۔ ابھی وہ لان کے وسط میں تھا جب کلثوم دوڑی دوڑی اس کے پیچھے چلی آئی تھیں۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' وہ اس کے سامنے آئی تھیں۔ بنا دیکھے وہ اسی طرح قدم اٹھا رہا تھا۔

''تم سے پوچھ رہی ہوں۔'' اس کی ماں کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ روتے روتے بولی تھیں۔

''تمہیں بہت سخت بخار ہے۔ اپنی حالت دیکھو۔ مت جاؤ تم۔'' وہ گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ بنا کوئی بات کے وہ گاڑی کا لاک کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔ کلثوم روتی اسے مایوس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں متورم تھیں بال بکھرے چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اچھی کنڈیشن میں نہیں تھا۔ سڑک پر رواں دواں گاڑیوں کے شور' ہارن کسی چیز پر اس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کا گھر ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ دس منٹ میں ہی وہ وہاں پہنچ گیا تھا گاڑی ان کے گھر کے قریب سڑک کے دوسرے کنارے روک چکا تھا۔ گھر کے باہر کافی لوگ تھے۔ گاڑی کے شیشے اس نے گرا دیئے تھے۔ اور دلسوزی سے اس گھر پر نظریں

جلوئی تھیں۔ اس کی نظریں بھاگتے دوڑتے لوگوں پر تھیں۔ اس کا باپ گہرے صدمے سے نڈھال کسی کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ دور سے ہی وہ اس کے چہرے کی رنگت اس کی کملائی صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ گاڑی سے نکل آیا تھا۔ گاڑی سے ٹیک لگا کر وہ بے آواز رو رہا تھا۔ وہ نظارہ بڑا اندوہ ناک اور دلدوز تھا۔ سفید کفن میں لاش کو آخری بار دیکھنے والے تابوت میں رکھ رہے تھے۔ اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ رشتے داروں کا **جمگھٹا** گیٹ کے اندر دکھائی دے رہا تھا۔ اندر سے تیز آواز میں بین کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ من موہنی صورت لاش بن گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جنازہ اٹھا تھا۔ اسے اس کے اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے نکالا جا رہا تھا۔ لوگ چل پڑے تھے۔ ایک غم گسار' ایک غمگین' ایک رنجیدہ' ایک لاچار' ایک مجبور' ایک بے بس انسان بھی آنسو پی پی کر شرکت کرنے والا تھا۔

✲ ✲ ✲

کمرے میں اندھیرا کیے وہ اوندھا لیٹا تھا۔ کمرے میں کوئی آیا تھا۔ کسی نے لائٹ جلائی تھی۔

"اٹھو کھانے کے لیے آؤ۔" وہ ماں تھی۔ ان کی پکار پر بھی وہ ہنوز لیٹا رہا۔ "کب تک یونہی پڑے رہو گے تھوڑا سا ہی کھالو۔" وہ بیٹھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ چلاتی بولی تھیں۔

"بھوک نہیں ہے مجھے۔" اس نے سپاٹ اور سرد سی آواز میں کہا تھا۔

"یہ کیا حالت بنالی تم نے اپنی آنکھیں دیکھو۔ کیا خود کو مارو گے تم۔" وہ یونہی اوندھا لیٹا تھا کچھ پل بعد اس کے وجود میں جنبش محسوس ہوئی تھی۔ اگلے ہی پل وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔

"کیوں خود پر ظلم کر رہے ہو۔ یہی زندگی لکھی تھی اس کی یہی عمر تھی اس کی۔" کلثوم دھیرے دھیرے اس کے بال سہلاتے بول رہی تھیں۔

"ہاں یہی عمر تھی اس کی۔ پر آپ لوگوں نے جلد ہی اسے وداع کرنے کا سوچا۔" اس نے طنز بھری آواز میں کہا تھا۔

"تقدیر کے فیصلے۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ تقدیر' تقدیر۔ آپ لوگ نہیں چاہتے تھے۔ تقدیر میں تھی وہ۔ پر آپ لوگ اسے میرا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ تقدیر کو الزام مت دیں۔" اس کے کڑوے لہجے پر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ کچھ پل کے توقف کے بعد وہ پھر سے بولی تھیں۔ "چلو اٹھو کھانا کھالو۔"

"مجھے نہیں کھانا۔" آنکھیں بند کر کے وہ جیسے لاتعلق ہو گیا تھا۔ اس کی ماں اٹھتے ہوئے رندھی آواز میں بولی تھی۔ "تم نہیں کھاؤ گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔" وہ یونہی لیٹا رہا تھا۔ رات کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ باہر چلا آیا تھا۔

"جب مر جاؤں نا تب بھی یونہی ہنسنا۔"

"تب تو قہقہے لگاؤں گا۔" وہ لان میں ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ دونوں گھٹنوں پر سر ٹکائے وہ جیسے اس دنیا میں تھا ہی نہیں۔

"ہاں لگاؤ قہقہے کہ اب وہ مر گئی۔" بے اختیار نہ آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ حلق میں کوئی گولا سا پھنس گیا تھا۔

"مرنا تو مجھے چاہیے تھا کہ خطا کار تو میں تھا۔ وہ کیوں مری۔" جانے کتنے پل بیت چلے تھے۔ خود سے اپنا غم بانٹتے۔ یاسیت کے گہرے سمندر میں ڈوبا وہ ایک مفلوک الحال شخص تھا۔ جس کا کوئی ہمدرد و غمگسار نہ تھا۔ آنکھوں سے بہتی نمی کو جانے کتنی دیر ہو رہی تھی۔ تسلسل برقرار تھا۔ کہ اس نے اپنے پاس کسی کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو بے ساختہ اپنی نظریں جھکا دی تھیں۔

"رونے سے وہ واپس آجائے گی۔" باپ کی آواز اسے بہت دور سنائی دی تھی۔ جبکہ وہ تو پاس کھڑے تھے سو پاس تھے لیکن کتنی دور تھے۔

"چلو اٹھو اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اسے اٹھایا تھا۔ وہ بنا کچھ بولے اٹھ گیا تھا۔ وہ اسے اس کے کمرے میں لے آئے تھے۔ اسے اپنی

نظروں کے سامنے لیٹنے اور لائٹ بجھاتے دیکھ کر وہ واپس چلے گئے تھے۔ وہ بیڈ پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ کوشش بے سود تھی۔ بار بار کروٹ بدلنے سے بھی نیند نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر ٹیبل لیمپ روشن کر چکا تھا۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نشہ آور ٹیبلٹ نکال کر پانی کے ساتھ اس نے نگل لی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں وہ ٹہلتا رہا تھا سوچتا رہا تھا۔ پھر واپس بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس پر غنودگی چھانے لگی تھی۔ اور وہ ایک گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ آفس جانا چھوٹ گیا تھا۔ اس کا باپ اسے سوگ منانے دے رہا تھا۔ دوپہر کو کھانے پر بھی انکار ہوا تھا۔ سر میں شدید درد تھا ملازمہ کو چائے کا کہہ کر وہ نگین کی اور اپنی پکچرز دیکھنے لگا تھا۔ جو انہوں نے دوران سیر کھینچی تھیں۔ ملازمہ چائے لے آئی تھی۔ چائے رکھ کر وہ ہنوز کھڑی رہی تھی۔ وہ حیرت میں مبتلا اسے دیکھنے لگا تھا۔

"کیا بات ہے؟" آخر اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔ اس نے نوٹ کیا تھا ملازمہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہنے سے گھبرا رہی تھی۔ ذرا سی شہ پا کر جھجک دور ہو گئی تھی۔

"صاحب جی آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ آپ کی وجہ سے بیگم صاحبہ بھی نہیں کھا رہیں۔ وہ بھی بھوکی بیٹھی ہیں۔ صاحب جی برا نہ مانیں۔ پر وہ آپ کی ماں ہیں۔ ماں کی خاطر ہی کچھ کھا لیں۔" یہ کہتے ہی وہ اسے کشمکش میں مبتلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اور وہ ماں کو سوچنے لگا تھا۔ اگر ماں کے دل میں بیٹے کے لیے محبت تھی تو بیٹے کے دل میں بھی ماں کی محبت تھی۔ وہ خود کو تکلیف پہنچا سکتا تھا پر ماں کو ہرگز نہیں۔ اس لیے وہ کچن میں جا کر ملازمہ کو کھانا لگانے کا کہہ کر ماں کے پاس آیا تھا۔

"چلیں انھیں کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے ماں کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی ماں خوشی سے نہال ہوتی اس کے ساتھ ہو لی تھی۔

رات کو نیند نہ آنے کے باعث وہ نشہ آور ٹیبلٹ استعمال کر رہا تھا۔ اس کے متواتر استعمال نے اس کی تاثیر ختم کر دی تھی۔ کچھ ہی عرصہ میں اس نے محسوس کیا کہ ٹیبلٹس اس پر اثر انداز نہیں ہو رہیں تو اس نے ہائی ڈوز لینی شروع کر دی تھی۔ اس کے باپ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اسے سختی سے منع کیا تھا۔ جس کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ دن پر دن گزر رہے تھے۔ اس کی بے چینی اس کی تڑپ کو کوئی قرار نہ آیا تھا۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو کفن میں ڈالنے والا وہی تو تھا۔

انسان اپنی آئی موت کو کبھی ٹال نہیں سکتا۔ ابارشن ایک بہانہ تھا۔ اس لڑکی کے زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے۔ ابارشن میں پیچیدگی اور اس کی بگڑی حالت موت کا ایک حیلہ تھا۔ ڈاکٹر نے جو رائے دی تھی اس کے مطابق یہ موت خون کے زیاں سے ہوئی تھی۔ اور ہائی بلڈ پریشر۔ اس کی زندگی کے دن پورے تھے۔ ان پورے دنوں کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مرد خود کو مجرم تصور کر رہا تھا اسے اپنے جرم کی ہولناکی کا اندازہ تھا۔ جب ہی سکون کی ہلکی رمق بھی دیکھنا نصیب نہ ہو رہی تھی۔

ماں باپ کی طرح ٹیبلٹس نے بھی اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ان بجھے لمحوں میں ایک آخری سہارا ابھی دغا دینے لگا تھا۔ نیند تو نیند مصنوعی نیند بھی جلن دینے لگی تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی ہی تو تھی کہ ہر غم یک دم ٹوٹ پڑا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ اس صورتحال سے تنگ آ گیا تھا۔ ساری ساری رات جاگتے کٹ جاتی تھی۔ سوچ سوچ کر ذہن مفلوج ہونے لگا تھا۔ بے بسی انتہائی عروج پر پہنچ چکی تو رات کو ہی وہ گھر سے نکلا تھا۔ کچھ اسٹریس چھوڑ کر ڈاکٹر وقار کا گھر تھا۔ نیند کی ٹیبلٹس بھی وہ اسی سے لیا کرتا تھا۔ وہ ڈاکٹر آج کل کے دنیا دار ڈاکٹروں کے جیسا ہی تھا۔ اسے اپنے پیسے سے غرض تھی۔ کسی کا بیڑہ غرق ہوتا ہے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ڈاکٹر ٹی وی کے سامنے بیٹھا نیوز دیکھ رہا تھا جب ملازمہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ "گیسٹ روم میں بٹھا دو۔" ملازم سے کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم چلا گیا تھا۔ بیوی کو بتا کر

وہ گیسٹ روم آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ینگ مین سے اس کے ہونٹوں پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ رسمی گفتگو کے بعد اس نے اپنا مدعا پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر نے ہلکا سا عذر تراشا تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا بے خوابی نے پریشان کیا ہے۔ اگر آپ نہیں کر سکتے تو میں کسی اور ڈاکٹر سے نشہ آور انجکشن لگوالوں گا۔" وہ حقیقتاً پریشان تھا۔ اسے نہ جانے کیوں اپنے وجود سے ہی کچھ ضد سی بندھ گئی تھی۔ سب کچھ تہس نہس کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ساری دنیا کو۔ خود کو ہر چیز کو۔ کچھ پس و پیش کے بعد ڈاکٹر نے انجکشن لگوا دیا تھا۔ رقم دے کر وہ گھر چلا آیا تھا۔ اس رات اس نے گہری نیند لی تھی۔ ایک انجان سا سکون رگ و پے میں محسوس ہوا تھا یہ سکون جسم بے تاب کو بہت بھلا محسوس ہوا تھا۔ اور پھر یہ سکون آمیز سلسلہ کچھ دن پر محیط نہ رہا تھا۔ یہ سلسلہ بڑھتا گیا تھا بڑھتا گیا تھا۔ مصنوعی نیند، غم سے چھٹکارہ اگر ایک انجکشن کے ذریعے ممکن ہو سکتا تھا تو یہ ایک نعمت ہی تو تھی۔ وہ اس احساس سے اپنا دامن چھڑانا چاہتا تھا۔ جسے عشق محبت کہتے ہیں۔ یہ احساس ایک بلا کی مانند اس کے وجود کو نیست و نابود کرنے پر تل گیا تھا۔ اس "مصنوعی" سہارے کی خبر صرف اسی تک محدود تھی۔ کبھی کبھار وہ دفتر جاتا تھا۔ کبھی کبھار دفتر چھوٹ جاتا تھا۔ باپ کے واویلے پر وہ پھر سے دفتر چل پڑتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ وہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس کی ماں اپنی نگرانی میں صفائی کروا رہی تھیں۔ ملازمہ ڈسٹ بن اٹھا کر ان کے پاس لاتے ہوئے، بہت تحیر بھری آواز میں بولی تھیں۔

"بیگم صاحبہ اس ڈبے میں تو اتنی دوائی کی شیشیاں ہیں۔" ملازمہ کی آواز و لب و لہجے پر وہ بھی متفکر ہو کر کھڑکی کا پردہ سرکا کر سرعت سے اس کی جانب آتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ڈسٹ بن لے کر اس کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ سارا ڈسٹ بن چھوٹی شیشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی تھیں۔ غور سے دیکھتے ہوئے انہوں نے جب اندر جھانکا تو بے شمار سرنج کھلی پڑے تھے۔ ایک شیشی نکال کر وہ ملازمہ سے کہنے لگی تھیں۔

"اسے پھینک آؤ۔ اور سنو کسی کو کچھ بتانا نہیں۔"

وہ گھبرائی تھی فوراً ہی بولی تھی۔

"بیگم صاحبہ میں کیوں بتاؤں گی بھلا۔" وہ چل دی تھی۔ وہ شیشی لیے اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔ اس وقت ان کا سر چکرا رہا تھا۔ ان کا بیٹا اس روش کو بھی اختیار کرے گا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ گہری الجھن میں جتلا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے سوچنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اردو اور انگریزی ادب سے شاہکار انتخاب

عمران ڈائجسٹ

نومبر 2005ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

☆ معروف مصنف اسلم راہی کے قلم سے تاریخی صفحات...... عمران کے قارئین کے لیے بطور خاص

دو تہلکہ خیز سلسلے

☆ ایک نوجوان کی حیرت انگیز داستان، جو ننھی سی عمر میں ہی دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ نیا پُرتجسس سلسلہ "آتش زادہ"

☆ حالات کی گود میں پل کر جوان ہونے والے ایک آتش صفت کی حیرت انگیز سرگزشت ایم اے راحت کے قلم سے "عقاب"

☆ ادب سے انتخاب

☆ زندگی کے تلخ حقائق سے منتخب "سچی داستانیں"

☆ "گلدستہ" قارئین کی تحریروں سے سجا سلسلہ

اس کے علاوہ بہت سی دلچسپیاں

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

عثمان کو اپنے کمرے میں بلا کر وہ اس سے حتمی بات کرنا چاہتی تھیں۔ اس کی "مرضی" یا اسے شادی کے لیے تیار کرنا ضروری تھا۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں وہ جب ان کے کمرے میں آیا۔ سیاہ شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ نشے کی حالت میں نہیں تھا۔ جب ہی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ماں کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں نے تمہیں ایک اہم بات کے لیے یہاں بلایا ہے۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ تم سنجیدگی سے اس پر سوچو۔ جو بات میں تم سے کہنے جا رہی ہوں اسے میری آخری خواہش سمجھنا۔ اگر مجھے اپنی ماں سمجھتے ہو تو تمہیں میری اس خواہش کا احترام کرنا پڑے گا۔" وہ کہہ رہی تھیں اور وہ سن رہا تھا۔

"آپ کی ہر خواہش تو پوری کرتا رہا ہوں۔ آج تک میں اپنی کوئی خواہش پوری نہیں کر سکا۔" وہ دل میں ماں سے مخاطب تھا۔

"ماں باپ کا اولاد پر بڑا حق ہوتا ہے۔" ماں ناصحانہ انداز میں سمجھا رہی تھیں۔

"تمہارے مستقبل کے لیے ہم نے بہتر سوچا ہے۔" ان کی آواز سناٹے میں گونجی تھی۔

"میرے مستقبل کے لیے میں نے بھی بہتر سوچا تھا۔ پر آپ نے یقین نہیں کیا۔" شکوہ دل میں ابھرا۔

"ماں باپ کبھی بھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔" ماں کا ہاتھ اس کے بالوں میں رینگنے لگا۔

"ہاں اولاد بھی کبھی بھی اپنا برا نہیں چاہتی۔" وہ پھر سے شکوہ کناں تھا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔"

وہ سوچوں کے گرداب سے یک دم نکلا۔ اس نے تحیر بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ اس کی ماں اس قدر سنگین مذاق بھی کر سکتی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"بولو، خاموش کیوں ہو۔ جواب دو۔ ہم بہتر اور ٹھیک سوچ رہے ہیں نا۔" وہ جیسے ہوش میں آگیا۔

"کس نے کہا کہ بہتر اور ٹھیک سوچ رہے ہیں۔" اس کی سپاٹ سرد آواز پر اس کی ماں چپ ہو گئیں۔

"بہتر اور ٹھیک تو آپ نے اس وقت نہیں سوچا جب آپ کو بہتر اور ٹھیک سوچنا چاہیے تھا۔ اب کیا رہ گیا ہے سوچنے کو۔" وہ تلخ سا ہو گیا۔

"میرا بھلا کتنا چاہتے ہیں آپ دونوں" اس کا اندازہ پچھلے دو سالوں سے ہو رہا ہے مجھے۔ مجھ سے بڑھ کر میرا بھلا کوئی نہیں چاہ سکتا۔ جب میں اپنی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کر سکا تو آپ لوگ کیا کریں گے۔" اس کے کاٹ دار لہجے پر وہ کچھ نروس سی ہو گئی تھیں۔ کچھ توقف کے بعد بولیں۔

"ماں کو اتنا بھی حق نہیں کہ بیٹے کے سامنے اپنی کسی ایسی خواہش کا اظہار کرے۔"

"بیٹے کو بھی اتنا حق نہیں تھا کہ ماں باپ کے سامنے اپنی کسی ایسی خواہش کا اظہار کرتا۔ جس پر عمل کرنے کے بجائے بیٹے کو زنداں میں ڈال دیا گیا۔" وہ گلوگیر اور افسردہ لہجے میں کہتا ماں کے کلیجے پر جیسے برچھی چلا گیا تھا۔

"زنداں میں تم نے خود کو خود ڈالا ہے۔" اس کی ماں نے رندھی آواز میں کہا۔

"ہاں جب میں برا ہوں تو پھر کسی کی زندگی خراب کرنے کی۔۔۔۔ ضرورت ہی کیا ہے کہ دوسرے اچھے بندے کو برباد کر دیا جائے مجھ جیسے برے انسان سے اس کا نصیب جوڑ کر۔ یونہی جل مرنے دیں مجھے۔" وہ بہت تلخ ہو رہا تھا۔ اس کا گرم لہجہ ماں کو تپا رہا تھا لیکن وہ کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے کڑوی کسیلی باتوں کو برداشت کر رہی تھیں۔ وہ اٹھ گیا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"مجھے اپنا ہوش نہیں تو کسی اور کا کیا ہوش رہے گا۔ کسی کو عذاب میں مبتلا نہ کریں آپ۔ دو کے بجائے ایک زندگی خراب ہو رہی ہو تو بہتر ہے۔" قطعی انداز میں کہتا وہ چلا گیا تھا۔ وہ سوچوں میں الجھی فکرمندی سے اس مسئلے کا حل سوچنے لگیں۔

انہوں نے شوہر سے بات کی تھی۔ باپ نے بھی

بیٹے کو بھلا بیٹھیں اس نے باپ کے سامنے صاف
انکار کر دیا۔ سوچوں میں منتقل تھیں۔ اس روز ان
کی زندگی کے [illegible] تھے۔ وہ ان کی بات مانتے تو آج
وہ اس روز ان [illegible] آج [illegible]
تک [illegible] بڑی رہی ہے۔ دونوں میں کوئی [illegible] انہیں دیکھتے
ان کے کمرے میں جاتا تھا۔ [illegible] سے عشق تھا۔ اس
کے ساتھ [illegible] کی بات [illegible] اس نے
غیر ضروری بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ بالکل خاموش
سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ صحت کی [illegible] کے بعد تک کی
وہ بیمار کہا تھا۔ اس وقت بھی ان کے پاس بیٹھا ان
کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

"میں ہوں تمہاری ماں۔ مرتی تمہارے لیے
آج سے پہلے میں تمہاری بہتر زندگی کی دعائیں مانگتی
رہی ہوں۔ آج کے بعد میں اپنی موت کی دعائیں
مانگوں گی۔ میرا [illegible] بیٹا [illegible] مجھ سے برداشت نہیں
ہو گا۔" وہ رونے لگی تھیں۔ وہ ان کے [illegible] تھا اس کی
بھی [illegible] تھی۔ قصور کون تھا؟

"ہمیشہ آپ لوگوں کی خواہشات کی بھینٹ ہی تو
چڑھا ہوں میں۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ سارے
اختیارات آپ لوگوں کے پاس ہی تو تھے۔ جس کالج
میں ایڈمیشن لینا چاہتا تھا اس میں نہ لے سکا۔ آپ
لوگوں کی خواہش کے باعث۔ میں آرمی میں جانا چاہتا
تھا۔ بابا نے کہا وکالت میں آؤ۔ وکالت میں بہت
ہے۔ کس کی خواہش پوری ہوئی میری یا ان کی۔ بابا
نے کہا [illegible] کو چھوڑ دو۔ میں نے چھوڑ دیا۔ پھر کہا [illegible]
کو چھوڑ دو میں نے چھوڑ دیا۔ اب آپ کہہ رہی ہیں کہ
شادی کر لو۔" سوز و رنج کی کیفیت میں مبتلا بے خود سا
بولے جا رہا تھا۔

"میں شادی نہیں کروں گا۔ آپ بھلا مرنے کے لیے
تیار ہو گئیں۔ اگر میری خواہش پوری ہوئی تو آپ
آپ زندہ نہیں رہیں گی۔ اگر آپ کی خواہش پوری
ہوئی تو میں۔ میری خواہش پوری ہو اور آپ نہ ہوں
ایسا تو میں مر کر بھی نہیں چاہتا۔ آپ روزانہ اپنی موت
کے لیے دعائیں مانگتی ہیں۔ تو میں آپ سے آج پہلی
بار آخری مرتبہ اپنی خواہش پوری کر لوں کر جاتے
اپنی موت کے آپ بھی موت کی دعائیں مانگتے رہیں
کی دعا اللہ کے کان میں [illegible] قبول ہو گئی [illegible]
معافی [illegible] میں اپنی خواہش پوری [illegible] تھی
بھی تو کوئی خواہش ہے ہی نہیں۔ [illegible] کی
خواہشات نہیں ہوا کرتیں۔" وہ رو رہا تھا۔ "میری تو
کوئی خواہش ہے ہی نہیں۔" وہ [illegible] لگا
تھا۔ "آپ لوگوں نے کبھی میری بات کو سمجھا ہی
نہیں۔ کبھی میری کسی خواہش کا احترام کیا ہی نہیں۔
آپ اگر [illegible] مجھ سے پیار [illegible] بھی [illegible] اور
نہیں کر [illegible] میں تمہارا نکاح [illegible] تو وہ بھی
کر لوں گا۔ کر [illegible] خواہشات کا [illegible] کب [illegible] رہ
ہو گا۔ اس شادی سے اس نکاح سے بھلا کیا ہو جائے
گا۔" وہ مسلسل [illegible] رہا تھا۔ اس کی آواز
سسکیوں کے [illegible] کر رہ گئی تھی۔

"ایک کنوارا ایک [illegible] انسان کی آواز ہی کیا
ہو گی کہ وہ ایک طاقتور انسان کی بات کو اس کی کسی
کی خواہش کو رد کرنے میں [illegible] تو بھی کچھ نہیں
کر سکتا۔" وہ بھیگی آواز میں کتنا [illegible] دکھائی دے رہا
تھا۔ اس کے بے رحم سفاک الفاظ سے اس کی ماں
کی [illegible] کیفیت رہی تھی کہ وہ نہیں جانتا تھا۔

"آپ اپنی خواہش پوری کریں۔ کر دیں میری
شادی۔ جو آپ کہیں گی وہ میں کروں گا۔ میں تو آپ
دونوں کا غلام ہوں۔ میں وہی کروں گا جو آپ کہیں
گے۔" وہ بیڈ سے اترنے لگا تھا۔ وہ برداشت نہ کر
پائیں۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اسے اپنے بازوؤں میں
بھینچ لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بھی ان
کا ساتھ دینے لگا۔

☼ ☼ ☼

ماں کو اس نے اجازت دے دی تھی اندر دل کی
حالت کیا تھی وہ صرف وہی جانتا تھا اسے شادی سے
یا بیوی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بس وہ ماں کی آرزو کو
پورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ماں کا کہنا تھا۔ وہ سوگ منانا چاہتا

تھا۔ وہ سوگ منا رہا تھا۔ نشے کی زیادتی کے باعث وہ کچھ دن سے آفس بھی نہیں جا رہا تھا۔ کلثوم خوش تھیں۔ دوسرے ہی دن رشتہ لے کر ان کے گھر پہنچ گئی تھیں صدیقہ کے ہمراہ وہ ان کے گھر دو بار گئی تھیں۔ لڑکی کی ماں اس رشتے سے بہت خوش تھی۔ سوچ بچار کے لیے انہوں نے وقت مانگا۔ صغریٰ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بیٹی کا رشتہ اس قدر امیر اور شہرت یافتہ گھرانے سے آئے گا۔ خوشی سے نہال اس عورت کو یہ خبر نہیں تھی کہ وہ بیٹی کے نصیب پھوڑنے جا رہی ہے۔ وہ اس بات پر شکرانے پڑھنے لگی تھیں کہ اتنے بڑے گھر سے ان کی بیٹی کے لیے پروپوزل آیا تھا ان کے شوہر خود حیرت میں مبتلا تھے۔ اس رشتے کو انہوں نے بیٹی کے حسن اور ذہانت سے محمول کیا تھا۔ اس کے والد چچا ان کے گھرانے اور لڑکے کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ اگرچہ اتنے نامی گرامی وکیل کے نام سے تو ہر کوئی آشنا تھا۔ تاہم ان کے گھرانے کی شرافت کردار کے بارے میں قرب و جوار کے لوگوں سے ہی معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ وہ لڑکا وکیل تھا۔ باپ کے دفتر میں ان کے ہمراہ وکالت کرتا تھا۔ اس کے اخلاق کے سب قدردان تھے۔ اس کی ذہانت کے بھی قائل تھے۔ رشتہ اچھا ہے سب جگہ سے یہی جواب مل رہا تھا۔ رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ منگنی سادگی سے کر دی گئی۔ شادی ایک مہینے کے اندر اندر ہی طے کر دی گئی تھی۔ صغریٰ اور ان کے شوہر اتنی جلدی تیاری سے کترا رہے تھے۔ "مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے سوائے آپ کی بیٹی کے۔" کہہ کر ان کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ جہیز کی استطاعت ان کی نہیں تھی۔ جو تھوڑا بہت وہ کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

آنے والی اس کی زندگی کو کیا رخ دینے والی تھی۔ اس سے باخبر صرف ذات پاک تھی۔ وہ عورت اپنے بیٹے کے لیے دوا خریدنے چلی تھی۔ اب دوا کو اپنا اثر دکھانا تھا۔ یہ اس مریض کی قسمت تھی۔ کہ وہ اس دوا سے شفایاب ہوتا ہے یا نہیں۔

٭ ٭ ٭

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ وہ دلہن سپنوں کے محل میں آ چکی تھی۔ گھر کے اندر جشن کا سماں تھا۔ مووی میکرز ان حسین نظاروں کو کیمرے میں قید کر رہے تھے۔ کیمروں کی چکا چوند تھی۔ اس بے پناہ اودھم میں کہیں آواز ابھری تھی۔

"دولہا کو بلا کر دلہن کے پاس بٹھاؤ بھئی۔" کچھ دیر بعد دو خواتین اسے پکڑے اندر لا چکی تھیں۔ اسے اس کے پاس بٹھا دیا گیا تھا۔ تقدیر کے کھیل نرالے ہیں۔ وہ جو اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتی دل ہی دل میں رب کریم کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس بات سے ناواقف تھی کہ اس کی زندگی کس تیرگی شب سے دوچار ہو چکی ہے۔ جو مرد اس کے پہلو میں بیٹھا اس کے اوراق زندگی کو بدلنے والا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کی ہستی کو ہی بدل ڈالے گا۔ وہ خوش گمانی میں گھری دل میں حسین زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ جبکہ دوسری جانب شدت غم سے پھٹے دل و جسم کو قرار دینے کے لیے دوا درکار تھی۔ جو اسے بالکل غافل کر دیتی دنیا کی ہر تکلیف سے۔ ہر قسم کی بے بسی سے۔ متلاطم جذبات حواس کو مختل کر رہے تھے۔ شوریدہ سری کی کیفیت میں گھرا وہ ضبط و برداشت کے انتہائی عروج پر کھڑا تھا۔ دل بے چین اس شور ہنگامے سے کہیں دور صحرا کا پھول بنا تنہا و ویران کھڑا تنہائی سے کھیل رہا تھا۔ اضطراب کی کیفیت وجود پر پھیل گئی تھی۔ چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ قرار کی ایک ہی صورت تھی۔ لیکن کیسے؟! اتنی بھیڑ میں کیا وہ نشے کی چند بوندیں اپنے جسم میں منتقل کر سکتا تھا۔ ساتھ میں کون بیٹھا تھا وہ بھول گیا تھا۔ نشہ کیسے انڈیلے یہی سوچ لاحق تھی۔ وہ جو دل میں لاکھ خوش فہمیاں لیے بیٹھی تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے پہلو میں بیٹھا مرد آنے والی زندگی کے حسین لمحوں کو نہیں ایک سرنج نشے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس لڑکی کو اس بات کی خبر ہو جاتی تو شاید وہ زندہ ہی نہیں رہتی۔ بے شک لاعلمی میں بھلائی

بے۔ وہ بھی لاعلم تھی۔

شاید دنیا میں بہت سی مائیں ایسی ہوں۔ جنہوں نے بیٹوں کی سہاگ رات کو جھولیاں پھیلا کر اپنے بیٹوں سے بیویوں کے ساتھ درست رویہ رکھنے کی بھیک مانگی ہو۔ اس سے وعدے قسمیں لیے ہوں کہ وہ ماں باپ کو دنیا کے سامنے شرمندہ نہیں کریں گے۔ وہ عورت بھی ان میں سے ایک تھی۔ وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے رو رو کر اسے یہی کہے جا رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہا تھا یا نہیں یہ سننے والے کو علم تھا۔ اپنی طرف سے انہوں نے اس سے ہر طرح کے وعدے لیے تھے۔ قسمیں دی تھیں۔ وہ بت بنا بیٹھا تھا۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں کی عجیب باتوں کو سوچ رہا تھا۔ ایک خواہش بس آخری خواہش پھر اس کے بعد دوسری آخری خواہش۔ آخری تمنا۔ ماں باپ اولاد اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے پیدا کرتے ہیں۔ ذہنی رو بھٹک رہی تھی۔ مجنونانہ احساسات نے پوری طرح گھیراؤ کر لیا تھا۔

لب خاموش تھے۔ دماغ کی رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ گرم لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اس جلتے لاوے کا نشانہ کون بنے۔ سامنے جو عورت بیٹھی ہے وہ ماں ہے۔ اس لیے دل کی بھڑاس وہ اس پر نکال ہی نہیں سکتا۔ جو مردانے میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھا بیٹے کے گھر بسنے کی خوشیاں منا رہا ہے۔ وہ باپ ہے۔ کیسے تکلیف دے کہ یہ تو اپنے ہیں۔ کیسے جلا کر بھسم کر دے۔ خود کو تو وہ دے رہا ہے سزا اور کیسے اذیت دے۔ ویسی ہی جیسی اسے دی گئی ہے۔ ماں رو رہی تھی۔ وہ اپنے حال میں لوٹ آیا تھا۔

"جو آپ نے چاہا وہ ہو گیا اور آگے بھی وہی ہو گا جو آپ چاہیں گی۔ اپنی زندگی پر مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ آپ لوگ جس راہ پر لگا دیں گے اسی پر چل پڑوں گا۔" وہ ماں کو دلاسا دے رہا تھا یا طنز کر رہا تھا۔ وہ خود سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کوئی کمزوری سارے جسم کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔ پر سامنے بیٹھی عورت سے کیا اپنا وعدہ بھی تو یاد تھا۔ کیا وہ اپنے وعدے پر کاربند رہ پائے گا؟ ہلکا ہلکا پسینہ ماتھے پر عیاں ہونے لگا۔ تذبذب میں مبتلا وہ اٹھ گیا۔ وہ بھی اس کی تقلید میں اٹھ گئی تھیں۔ ان کے کمرے سے نکل کر وہ زینہ طے کرنے لگا۔ وہ بھی کچھ قدم پیچھے ہٹی تھیں دروازے پر رکتے ہی وہ اچانک رک گیا۔

"جاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔" ماں کی آواز پشت پر سے آئی تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں دروازہ کھولتا اندر داخل ہونے والا تھا جب ماں کی آواز پر اس کا حرکت کرتا ہاتھ ساکت ہو گیا تھا۔

"ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔" وہ تیزی سے مڑ کر زینہ طے کر کے چلی گئیں۔ وہ لامتناہی سوچوں میں گھرا وہاں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آ گئی تھیں۔

"یہ اسے پہنا دینا اور کچھ غلط نہیں بولنا۔" انہوں نے عاجزانہ لہجے میں بڑی بیچارگی سے کہا تھا۔ وہ بے دلی سے کیس ہاتھ میں لے کر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

آہٹ پر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کمرہ بہترین انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ خوب صورتی کا تعلق اندر کے موسم سے ہوتا ہے۔ اگر اندر کا موسم اچھا ہو تو ہر بری چیز بھی خوب صورت دکھتی ہے۔ کچھ پھول پتیاں بیڈ پر بکھری تھیں۔ کمرہ ان پھولوں کی مدھر خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آتے ہی سب کچھ دھندلا پڑنے لگا تھا۔ سامنے بیٹھی لڑکی لڑکی نہیں تھی۔ بوجھ تھا جو اس کے سر زبردستی باندھ دیا گیا تھا۔ وہ سرخ گلابوں کی پتیاں نہیں تھیں سرخ خون تھا۔ اس کے ارمانوں' اس کی محبت' اس کے عشق' جنوں کا۔ یہ خوشبو نہیں تھی تعفن تھا۔ جو طبیعت کو بوجھل بنا رہی تھی۔ غرض من ہستی میں اس کے لیے اذیتیں ہی تھیں جو ہر پل وہ سہے گا۔ وہی ایک ہمیشہ قربانی کی بھینٹ چڑھے گا۔ وہ بے دھیانی کے عالم میں آگے بڑھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا کیس اس نے سامنے پڑے بوجھ کو تھما دیا تھا۔ بغیر کسی پکار کے بغیر کسی آواز کے وہ — مشینی انداز میں پکڑا کر واپس پلٹا تھا۔ وہ اپنے حواسوں میں

نہیں رہا تھا۔ اندر طلب جاگی تھی۔ چلا رہی تھی۔ اپنا احساس دلا رہی تھی۔ اس کی آواز پر اسے کان دھرنا پڑا۔ سدھ بدھ کھویا وہ اس پل ایک حرکی مشین کی مانند تھا۔ سر میں شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ جھک کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے وہ کچھ نکالنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ مطلوبہ چیز سائیڈ ٹیبل کی سطح پر رکھ کر۔ وہ بیڈ کے کنارے پر سکون انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی اسے یاد نہیں رہا تھا۔ ایک لڑکی اس کے نام سے تعلق جوڑ بیٹھی ہے۔ اسے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ لڑکی اس سے دو چار الفاظ سننے کی منتظر ہے اسے یاد نہیں رہا تھا۔ اگر کچھ یاد تھا تو وہ بڑا جاں گسل تھا۔ جاں گداز تھا۔ بے قرار وجود کو قرار دینے کے سوا اس وقت کوئی یاد یاد نہیں رہی تھی۔ سرنج بھر کر وہ اپنے دائیں بازو میں سمو چکا تھا۔ وہ جو گردن جھکائے جھکائے تھک چکی تھی۔ اس پاس بیٹھے مرد کی خاموشی پر لاشعوری طور پر وہ اپنا سر اٹھا چکی تھی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ وہ مرد جو اس کی جانب پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ اپنے ہاتھ میں سرنج گاڑے تھا۔ شاید اس کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ سوچ رہی تھی کچھ پل بعد اس نے شیشی اور سرنج ڈسٹ بن میں پھینک دیے تھے۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سر جھکا دیا تھا۔ اس مرد کی موجودگی سے وہ لڑکی کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف اسے لاحق تھا۔ وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے لیٹ گیا تھا۔ وہ اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا۔ ایک پل کو سرسری نگاہ ڈال کر جب اس نے دیکھا کہ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہے تو اس نے غور سے اسے دیکھا۔ ایک حیا آمیز مسکراہٹ اس کے محرابی لبوں پر پھیل گئی تھی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر بے پناہ یقین ہونے لگا۔ وہ اس کے خیالوں سے بڑھ کر تھا۔ تعریفیں اس نے اپنی کزنز سے سنی تھیں آج دیکھ کر یقین آ گیا تھا۔ صبیحہ چچی کی بات بے تحاشا یاد آئی تھی۔ "چاند سورج کی جوڑی ہے۔" چاند ٹھنڈک کا احساس دلاتا ہے۔ مدھم نیلی روشنی کا حسین مرقع۔ سورج گرمی کا احساس دلاتا ہے۔ گرم چبھنے والا۔ اس عورت کی بات سچ تھی یہ جوڑی چاند سورج کی تھی۔ کچھ دیر تک خاموشی بدستور جاری رہی۔ اس دبیز خاموشی کی تہہ کو اس مرد کی آواز نے توڑا۔

"تم ایک بدنصیب عورت ہو۔ سوری مجھے نہیں پتہ کہ تم عورت ہو کہ لڑکی ہو۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں اس کے لب ہل رہے تھے۔ اس کی آواز خوب صورت تھی۔ اس نے دل میں سراہا تھا۔ لیکن الفاظ بہت بھیانک تھے۔ اس کا تصور اس نے نہیں کیا تھا۔

"تمہاری بدنصیبی پر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ صرف مجھے نہیں۔ اس شادی میں جس جس نے شرکت کی ان سب کو تمہاری بدنصیبی پر افسوس ہو رہا ہے۔ میری ماں۔" کچھ پل سکوت چھایا رہا تھا۔

"میری ماں کو بھی تمہاری بدنصیبی پر افسوس ہو رہا ہے۔ تبھی ہاتھ جوڑ کر ٹھوڑی چھو کر میری منتیں خوشامدیں کر رہی ہے کہ میں تم سے درست رویہ رکھوں۔ وہ بھی تمہاری بدنصیبی پر افسوس کرتی ہے۔" وہ عورت بت بنی سن رہی تھی۔ وہ کیا بول رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ "تم بدنصیب میں بدنصیب، انعم بدنصیب، نگین بدنصیب، سب بدنصیب۔ خوش قسمت میری ماں، میرا باپ، خوش قسمت ساری دنیا۔" وہ بے تکان بول رہا تھا۔

"میری ماں کہتی ہے کہ میں تمہارے لیے ایک حسین لڑکی لے کر آئی وہ یہ نہیں کہتیں کہ کاش میں تمہارے لیے ایک حسین قسمت لے کر آئی ہوں جس میں کوئی انعم کوئی نگین جدا نہ ہو۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ لڑکی کے دل کو یکبارگی کچھ ہونے لگا تھا۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔ یہ شادی ایک دھوکا تھا۔ ایک فراڈ تھا۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ تم خوش قسمت ہوتیں۔" وہ اسے دوش دینے لگا تھا۔ "اگر تم خوش قسمت ہوتیں تو تمہاری شادی مجھ سے نہ ہوتی۔ تم اس جہنم سے بچ جاتیں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اس کی آواز میں اس کے انداز میں لڑکھڑاہٹ

محسوس کی تھی۔

"یا پھر مجھے خوش قسمت ہونا چاہیے تھا کہ مجھے نگین ملتی" پھر یکدم سے دکھ بھری آواز میں اپنی بات کی تردید کرنے لگا تھا۔

"اگر میں خوش قسمت ہوتا تو مجھے نگین مل جاتی۔" پھر خود سے سوال جواب کے انداز میں بولا تھا۔

"پر میں تو خوش قسمت ہوں ہی نہیں۔ نہیں بس تم خوش قسمت ہوتیں۔ کم از کم تمہیں تو خوش قسمت ہونا چاہیے تھا۔" وہ مدہوش نظروں سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے بغور دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نشے کے غلبے کے باعث اس کی آنکھیں پوری طرح کھل نہیں پا رہی تھیں۔ "میرا باپ کہتا ہے کہ لڑکی کو اور کیا چاہیے یہاں اسے اچھا کھانے کو ملے گا پہننے کو ملے گا۔ ساری جائیداد ملے گی پر اچھا لڑکا تو نہیں ملے گا نا اسے۔ تم رو رہی ہو۔" وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "رو مت خوش قسمت خوش نصیب تو میں بھی نہیں ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں تم سے۔ میں بھی نہیں ہوں۔ دیکھو کیا میں رو رہا ہوں۔ تمہیں صبر کرنا بھی نہیں آتا۔ مجھے دیکھو میں صبر کر رہا ہوں۔ ایک کو جیتے جی مار کر دوسری کو قبر میں اتار کر۔ پر میں رویا نہیں صبر کر رہا ہوں۔ تم بھی صبر کرو۔"

وہ دھیرے دھیرے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"تم ناراض ہو گئی ہو ماں نے کہا تھا کہ بیوی کو کچھ مت بتانا۔ پر میں تو کہہ گیا سب۔ اس لیے تم ناراض ہو کر رو رہی ہو۔ میں نے تمہیں بتا کیوں دیا۔ چلو تم اسے بھول جاؤ۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ اگر ماں بھی پوچھے تو تم کہنا کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہی نہیں۔ ٹھیک ہے نا۔ میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں روؤں لیکن..... مجھے تو بہت نیند آ رہی ہے۔ تم یوں ..... کرو کہ..... تم..... نہیں رو مت رونے سے کچھ نہیں ملتا رونے سے سکون نہیں ملتا..... س..... کو..... ن ..... ص..... ر..... ف..... اس..... دوا..... س..... سے ملتا ہے۔ میں سو..... رہ..... ہوں تم بھی....."

کچھ ہی پل میں وہ مدہوش ہو گیا تھا۔ ساری خوش فہمیاں بھک سے اڑ گئی تھیں۔ حقیقت ایک اژدھے کی مانند منہ کھولے بیٹھی تھی۔ جو ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی دولت سے ذہانت سے منسوب نہیں وہ عورت بھی اس مرد کی طرح ہر لحاظ سے ایک بد قسمت عورت تھی۔ وہ بد قسمت عورت دل کھول کر رونے لگی تھی۔

اچھی طرح رونے کے بعد وہ بیڈ سے اتر گئی۔ اپنا بھاری سرخ لہنگا ایک ہاتھ سے تھام کر وہ کارپٹ پر کھڑی پر سوچ نگاہوں سے کچھ پل اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ اس نے اس کے شوز اتارے۔ پھر موزے اتار کر جوتوں میں ڈال کر بیڈ کے نیچے رکھ دیے۔ پھر بڑی کوشش سے اس نے اس کی ٹانگیں بیڈ پر پھیلائیں۔ وہ ہڑبڑایا بھی تھا چونکہ نشے کے زیر اثر تھا اس لیے اس قدر گہری نیند سے اٹھ نہیں پایا تھا۔ وہ ابھی بھی صحیح پوزیشن میں نہیں تھا پر اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ بیڈ پر مکمل آ گیا تھا۔ اس کے اوپر کمبل ڈال کر وہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہی۔ کپڑے چینج کر کے وہ واپس بیڈ کی جانب آئی تھی۔ کچھ دیر کھڑی اسے سوتا دیکھتی رہی پھر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ کر لائٹس آف کر دی۔ ٹیبل لیمپ آن کر کے وہ صوفے کی طرف آئی اور صوفے پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک خالی الذہنی سے کچھ سوچتی رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ بے رخی کا اظہار کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ پریشانی اور فکر والی بات وہ انجکشن کی تھی کہ جس نے اسے بے خود کر دیا تھا۔

کیا وہ ان دنوں محبت میں ناکامی کے باعث شدید ڈیپریسڈ تھا اس لیے انجکشن استعمال کر رہا تھا کسی ڈاکٹر کی تجویز پر' بات چبھ رہی تھی یہ چبھن پورے وجود میں ہو رہی تھی۔

وہ نگین جو کوئی بھی تھی۔ اس سے اس کی نئی زندگی کی حسین شروعات' چاہے جانے کی خواہش اور سراہنے کی تمنا کا حق چھین چکی تھی۔ وہ ایک نہایت ظالم اور سنگدل عورت تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ جانے وہ کیا کچھ سوچتی رہی تھی نیند کی مہربان دیوی اسے

خوف دل کو لاحق ہوا تھا اس کا سدباب کرنا تھا۔ ولیمے کی تقریب کے باعث وہ بری طرح نڈھال ہو چکی تھی۔ رات کو دیر سے سوئی تھی اس لیے نیند آرہی تھی۔ اسے اس کے کمرے میں لایا گیا۔ یہ خوب صورت کمرہ اس وقت کتنا بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ باقی سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جبکہ وہ فاروق کے ہمراہ باہر لان میں تھا۔ فاروق اس سے کہنے لگا۔

"کیسی لگی تمہیں۔ پیاری ہے نا؟" اس نے بشاشت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"میں نے نہیں دیکھا اسے۔" فاروق سے وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا اسی لیے سچ کہہ گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ اس کے جواب پر ششدر رہ گیا جبھی حیرت زدہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"پھر تم کہاں تھے؟" یکدم سے دوسرا سوال داغا۔ فکرمندی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"اپنے کمرے میں ہی تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر دیکھا کیسے نہیں۔ کیا تم جاتے ہی سو گئے تھے؟" اس کے لہجے میں دبی دبی تشویش تھی۔ جس پر مقابل کو ذرا بھی پروا نہ تھی۔

"انجکشن کی طلب ہو رہی تھی وہ لیا پھر کچھ جان ہی نہ پایا کہ میں اس سے کچھ کہہ چکا ہوں یا نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ میں اس کے ساتھ بولا تھا کیا بولا تھا یاد نہیں۔ پھر میں شاید سو گیا تھا۔ صبح بیدار ہونے پر میں نے اسے سوتے دیکھا تھا۔ وہ کیسی ہے میں نے غور نہیں کیا۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ کیسی ہے۔" اس نے پرسکون انداز میں وضاحت دی۔

"تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی یہ سب فخر سے کہتے ہوئے۔ تمہیں پتہ ہے کہ وہ لڑکی تمہارے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آئی ہے۔"

"میرے لیے نہیں میرے ماں باپ کے لیے۔ وہی لے کر آئے ہیں اسے۔ یہ ان کی خواہش ہے۔ پھر میں تمہیں کہہ تو رہا ہوں کہ میں نشے میں تھا مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں کیا بول رہا ہوں کیا کر رہا ہوں۔ اس لیے اس بحث کو چھوڑ دو۔" اس کی بے حسی پر فاروق کو شدید طیش آیا تھا۔

"اس رشتے کو نبھا نہیں سکتے تھے تو ضرورت ہی کیا تھی ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کی۔" اس کا لہجہ آگ اگل رہا تھا۔

"میں نے نہیں کی میرے ماں باپ نے کی ہے ان سے کہو۔" وہ لاپروا اور مطمئن انداز میں بولا۔ اس کے ساتھ بحث کرنا پتھر سے سر ٹکرانا تھا اس لیے اس نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔

فاروق کے جانے کے بعد وہ بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں آیا۔ رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ نیند آ نہیں رہی تھی۔ البتہ بے چینی احاطہ کرنے لگی تھی۔ اس خیال سے ہی کوفت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ لڑکی اس کے کمرے میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اکتاہٹ آمیز تاثرات چہرے پر پھیل گئے تھے۔ ایک ہیجانی کیفیت نے گھیراؤ کر لیا۔ اشتعال کی ایک لہر سارے بدن میں جاگ اٹھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ سب کچھ تہس نہس کر دے۔ ایک جھٹکے سے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ دروازہ زور سے کھلنے پر اس کے اندر سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے اپنے لب بہت خشک محسوس ہوئے تھے۔ وہ بدستور پشت کیے کھڑی کھڑکی سے باہر روشن چاند کو تکے جا رہی تھی۔ جانے کیوں یہ وہم لاحق تھا کہ وہ عقب سے آ کر اس کی گردن دبوچ کر یہیں اس کا کام تمام کر دے گا۔ پشت پر کسی وار کا احساس بار بار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم سے آنسو آ گئے۔ چاند دھندلا دکھائی دینے لگا۔ ستارے غائب ہو گئے۔ آنکھوں میں صرف پانی کے قطرے تھے۔ یا پھر چاند کا ہیولا۔ ارد گرد سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ خوف کا غلبہ تھا۔ عجیب سی گھبراہٹ پورے وجود کو گھیرے میں لے چکی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ باتھ روم جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نائٹ ڈریس میں اس کی واپسی ہوئی تھی۔ ٹی وی آن کر کے وہ بیڈ پر آرام سے لیٹ گیا۔ دونوں پاؤں ہلاتا وہ چینل بدل

رہا تھا۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہاں کھڑی رہی۔ کچھ دیر تک چینلز پر چینلز بدلنے کا سلسلہ بدستور جاری رہا پھر ٹی وی آف کرکے ٹیبل لیمپ جلا کر باقی لائٹس اس نے آف کردیں۔ کھڑکی کے پاس کھڑی وہ چودھویں کے چاند کو دیکھنے لگی۔ گالوں پر قطرے لڑھک رہے تھے۔

چونکی جب آہٹ ہوئی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ وہ سوئچ بورڈ کی طرف گیا۔ لائٹس آن کرکے وہ واپس بیڈ کی طرف آیا۔ ایک سرسری نگاہ اس نے اس پر بھی ڈالی تھی۔ پھر جھک کر دراز کھول کر اس میں سے سرنج اور شیشی نکالی۔ کچھ پل میں سرنج اس کے بازو میں تھا۔ اب کی بار وہ خود کو روک نہیں پائی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کے پاس گئی۔ انجکشن لینے کے بعد وہ آنکھیں بند کیے کچھ پل لیٹا رہا۔ اسے اس کی آواز سنائی دی تھی۔

"آپ کو تکلیف ہو رہی ہے؟" آواز میں نرمی تھی۔ یہ سوال تھا یا طنز وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

"کوئی تکلیف نہیں۔" دھیرے دھیرے وہ نشے کے زیر اثر آرہا تھا۔

"تو پھر آپ یہ کیوں یوز کرتے ہیں؟" سوال میں سادگی تھی یا کوئی چوٹ۔ اب کی بار بھی واضح نہیں ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر بغور جانچنا چاہا۔ اس کی آنکھیں لڑکی کے چہرے پر اس کی آنکھوں پر جمی تھیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکالی تھیں۔ لڑکی کے چہرے یا آنکھوں میں طنز کی کوئی لکیر دکھائی نہ دی تھی۔ یعنی سادگی تھی۔ کافی دیر وہ آنکھیں بند کیے چپ رہا تھا۔

"میں یہ اس لیے یوز کرتا ہوں کہ اس سے دل کو راحت و سکون ملتا ہے۔ تنہائی میں یہ میری ساتھی بن جاتی ہے۔ مجھ سے میری تنہائی شیئر کرتی ہے۔ انسان کو وہ سرور دیتی ہے کہ ہر دکھ درد دور کردیتی ہے۔ جب تکلیف ملتی ہے نا تو ایک انجکشن بازو میں لگا دیتا ہوں سب تکلیفیں ختم۔ سب غم دور ہر آفت سے

چھٹکارا۔" اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ پھر یکدم سے خود کو سنبھالتا پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"آج بہت کوشش کی میں نے کہ میں یوز نہ کروں لیکن کیا کروں پورے جسم میں بے چینی ہونے لگتی ہے درد شروع ہو جاتا ہے۔" پھر بے ربط انداز میں کچھ دیر تک متواتر بولتا رہا تھا۔ پھر گہری نیند سو گیا۔ اس نے اس کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ ایک بار پھر وہ گلاس ونڈو کے پاس آگئی تھی۔ یعنی وہ نشہ کرتا تھا۔ ایک نشے باز سے اس کا پالا پڑا تھا۔ اس کی قسمت میں ایک حسین دولت مند پڑھا لکھا اسٹیبلش وکیل لیکن نشے باز لکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

فاروق نے اگلے ہی دن کلثوم سے سب کہہ دیا تھا۔ وہ فق چہرہ لیے حیران و پریشان الجھن زدہ رہ گئی تھیں۔

"یہ بات چھپانے والی نہیں تھی اس لیے بتادی میں نے آپ کو۔ بات چھپانے سے بگڑ سکتی ہے۔ یہی سوچ کر میں یہ سب کہنے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ میری باتوں نے تو اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔" فاروق بھی کافی فکر مند تھا۔ یہی بات کلثوم نے شوہر سے کہی تو وہ فوراً بولے تھے۔

"دیکھا اسی بات سے ڈرتا تھا میں۔ وہ انسان نہیں ہے جانور سے بھی بدتر ہے۔ جب ایک انسان کو اپنے نفع نقصان کی پرواہ نہ ہو تو وہ دوسروں کی کیا پرواہ کرے گا۔" پُراشتعال انداز میں بولتے وہ پورے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

"تم بھی اسے کچھ مت کہیں۔ کسی دن میں خود بات کروں گی۔ آج تو ان کے گھر جانا ہے دعوت ہے۔ اس موقع پر بدمزگی نہیں پیدا کریں تو بہتر ہے۔"

ماں کے گھر جانے سے پہلے ساس اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ تیار تھی چادر اوڑھ رہی تھی کہ انہوں نے اسے پکارا۔ ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ اسے بہت پریشان اور فکر مند دکھائی دیں۔ ان کی پریشانی کو وہ بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

"بیٹا۔" وہ رونے لگی تھیں۔ وہ کیوں رو رہی تھیں

اسے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا۔

"خدا کے لیے اپنے ماں باپ سے کچھ مت کہنا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ فی الحال وہ اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے۔۔۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ ہماری لاج رکھ لینا۔ ہمیں بے عزت نہ ہونے دینا۔" وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے رو رہی تھیں۔ وہ حیران تھی حیرانگی بجا تھی۔ اسے اس طرح کے ہونے کی امید کیوں نہیں تھی۔ سارے روشن پہلوؤں کو سوچتے سوچتے وہ اندھیروں میں ڈوبے پہلوؤں کو کیونکر بھول بیٹھی تھی۔ وہ انہیں خیالی نظروں سے دیکھ رہی تھی وہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔ چونک کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور بولی۔

"اس میں آپ کے لیے بے عزت ہونے سے زیادہ میرے

بے عزت ہونے کا امکان ہے۔ آپ بے فکر رہیے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" اس کا یہی لہجہ انہیں مطمئن کر گیا تھا۔ وہ اسے دعائیں دیتی اس کو اپنے ہمراہ لیے باہر آ گئیں۔

اس دن اس نے جتنے جھوٹ بولے تھے جتنی جھوٹی ہنسی ہنسی تھی اتنی پوری زندگی میں اس نے کبھی نہیں ہنسی تھی۔ اس دن اس نے جی جان سے سب کو اپنی خوشی اور اپنی خوش قسمتی کا یقین دلایا تھا۔ یہ یقین اس کے ماں باپ کو مطمئن کر گیا تھا۔

ماں باپ کو نہ بتانے میں کیا مصلحت تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ ہاں اتنا اسے ضرور معلوم تھا کہ اب جو کچھ ہو گیا تھا۔ اس کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ بتانے سے ماں باپ کو صرف اذیت ہی ہوتی۔ شادی کے تیسرے ہی دن انہیں اپنی بربادی کی نوید دینا اس نے ہرگز قبول نہیں کیا تھا۔ اگر کچھ دن کچھ مہینے وہ خوش رہ لیتے تو یہ بھی بڑی بات تھی۔

☼ ☼ ☼

شام کو موسم کافی ابر آلود تھا۔ گھنے سیاہ بادل آسمان پر تیر رہے تھے۔ کبھی کبھار ایک آدھ قطرہ بھی گر جاتا تھا۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وہ باہر لان میں چلا گیا۔ بے خیالی میں اس کی نگاہیں لان میں ننگے پاؤں ٹہلتی اس پر پڑی۔ مارچ کے مہینے میں ان گھنے سیاہ بادلوں نے ٹھنڈ پیدا کر دی تھی۔ لیکن وہ اس ٹھنڈ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ لان چیئر پر بیٹھا آسمان پر نگاہیں جما چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی نگاہیں خود بخود اس پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہ لان میں ٹہلتے وجود کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے ایک حسین بیوی لے کر آئی ہیں۔ ہاں وہ حسین تھی سب کہتے تھے پر اسے حسین کیوں نہیں لگ رہی تھی۔ شاید وہ لڑکی حسین تھی ہی نہیں۔ یا پھر اس کی اپنی نظر کمزور تھی۔ ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی نظریں بدستور اسی پر جمی تھیں۔ وہ اس کی بیوی نہیں تھی وہ نگین تھی۔ وہی اس موسم سے جی بھر کر لطف لیتی تھی۔ اس موسم کی خوبصورتی کو تمام تر شدت سے محسوس کرتی تھی۔ سامنے کھڑی لڑکی اس کی زندگی تھی۔ وہ اس کے پاس تھی۔ پر وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس نے دیکھا نگین ہنس رہی ہے۔ دماغ میں ایک شور سا برپا ہوا تھا۔ وہاں ایک ہی پکار تھی۔

"مر جاؤں نا تب بھی اسی طرح ہنسنا۔"

"نگین۔" وہ بے اختیار چلایا تھا۔ وہ جو پودوں کے نزدیک اس کی جانب سے پشت کیے کھڑی تھی۔ اس کی پکار پر یکدم اسے پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ اضطراری انداز میں دونوں ہاتھ مسلتا اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ وہیں سبز گھاس پر بیٹھ گئی۔

"نگین انعم کہاں ہے وہ ہے بھی یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ اگر ہے تو وہ کیوں نہیں ہے۔"

وہ اپنی ذات کے ہونے اور نہ ہونے کے مخمصے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ سر گھٹنوں میں دیے بازو اپنے گرد باندھے وہ فکر مند ہو رہی تھی۔

وہاں وہ کافی دیر بیٹھی اپنا تجزیہ کرتی رہی تھی۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ کچن میں چلی آئی۔ وہ کپ

چائے تیار کرکے اپنا کپ لاؤنج میں ٹیبل پر رکھ کر وہ دوسرا کپ لیے اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھا نظر آیا۔ نزدیک ہی سرنج اور شیشی پڑی تھی۔ اس کے بڑھتے قدم خود بخود دھیلے پڑ گئے تھے۔ اس نے بھی سر اٹھا کر دیکھا پھر اشارے سے اسے بلایا۔ اس کے دل میں عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ اس کے اس خفیف اشارے پر دل اس قدر خوش ہوگا اسے یقین نہ آ رہا تھا وہ بلا ارادہ اس کے قریب جا کر اسے سوالیہ نظروں سے تکنے لگی۔

"بیٹھو یہاں۔" اس نے اشارے سے کہا۔ وہ ٹرانس کی کیفیت میں گھری اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"تم میرے سامنے مت آیا کرو۔ ابھی ابھی مجھے تم نہیں تگین دکھائی دے رہی تھی۔ تم تگین نہیں ہو۔ اس لیے تم میرے سامنے مت آیا کرو۔ مجھے تگین چاہیے۔ تگین میری زندگی ہے۔ وہ مر گئی تو کیا ہوا وہ یہاں زندہ ہے۔" اس نے دل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اگر تم بھی تگین کو دیکھتیں تو تمہیں بھی اس سے محبت ہو جاتی۔ وہ محبت تھی اس محبت کو میرے ماں باپ نے مار دیا۔ اگر تم محبت ہوتیں تو تمہیں بھی مار ڈالتے۔ پر تم محبت نہیں ہو۔ تمہیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ڈرو مت ڈرنا تو مجھے چاہیے۔ سزا تو وہ صرف مجھے دیتے ہیں۔ تم بھی ایک سزا دو۔ ایسی سزا جو مجھے تکلیف میں مبتلا کر رہی ہے۔ تم سب سے بڑی سزا ہو۔ میں یہ سزا نہیں جھیل سکتا۔ تم اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤ یا پھر کہیں چھپ جاؤ۔ یا غائب ہو جاؤ۔" وہ بول رہا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ کو ذہن کے سلیٹ پر لکھ رہی تھی۔ اس کے جملے اس کے دماغ پر ثبت ہو رہے تھے۔ اس کے الفاظ ہولناکی کے انتہا پر کھڑے اس پر منہ پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔ اس وقت سامنے بیٹھا فرد مخبوط الحواس لگ رہا تھا۔ وہ اس کا شوہر نہیں تھا۔ وہ اس طرح کے الفاظ نہیں ادا کرتا تھا۔ ہاں یہ الفاظ ایک مدہوش انسان کی زبان سے ہی ادا ہو رہے تھے۔ اس لیے اس نے برا نہیں مانا۔ اس لیے بولی۔

"تگین کو کیا ہوا تھا؟" یہی موقع تھا کچھ جاننے کا۔

"وہ پریگننٹ تھی میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میرا بچہ میری تگین دونوں ختم۔" وہ مختل حواس سے اس کے انکشافات کو سن رہی تھی۔ بدحواسی کے عالم میں اسے بتکی رہ گئی اس کے اعصاب پر لگنے والا یہ اس کی زندگی کا پہلا اور آخری شدید ترین وار تھا۔ حقیقی معنوں میں اپنی بے وقعتی کا احساس اب ہوا تھا۔ ایک بدکردار شخص اس کا جیون ساتھی بنا دیا گیا تھا۔ ایک بدکردار کے لیے ایک نیک کردار عورت کیا تم نے تعریفی نہیں تھی۔ وہ ہی کیوں۔ اندر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اس نے گالوں کو چھوا۔ اس کے گال گیلے تھے یعنی وہ رو رہی تھی۔ وہ شخص اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو بیان کر رہا تھا۔

"تمہارے ساتھ بہت برا ہوا۔ لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کوئی الزام نہ دینا۔ یہ سب تو میری ماں نے کیا۔ میرے باپ نے کیا میری ماں۔ وہ ماں جس کے قدموں تلے جنت ہے۔" کچھ دیر رک کر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم تو مجھ سے بھی بڑھ کر مظلوم ہو۔ میرا قصور تو محبت کرنا تھا تم نے تو یہ خطا بھی نہیں کی پھر بھی تمہیں۔۔۔ ارے میں تو یوں کہہ رہا ہوں جیسے مجھے آگاہی ہو کہ تم نے محبت نہیں کی۔ یقیناً تم نے بھی کی ہوگی۔ یہ ماں باپ ہوتے ہی ایسے ہیں اولاد کی خوشی ان کا بھلا نہیں چاہتے۔ میرے ماں باپ نے میرے لیے بہت کچھ چاہا سوائے بھلا چاہنے کے۔" وہ اٹھ گئی۔ اس شخص کی باتیں تکلیف دے رہی تھیں۔

٭ ٭ ٭

اسے فاروق کی منگنی کے فنکشن میں شرکت کرنی تھی۔ وہ تیار ہو کر عثمان کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی ساس رات سے ہی وہیں تھیں۔ فاروق عثمان کا کزن تھا اس کی منگنی میں شرکت کرنا لازمی تھا۔ وہ

آفس سے آگیا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ وہ فوراً تیار ہو کر آگیا۔ وہ پورچ میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت وہ اسے بہت ہشاش بشاش موڈ میں دکھائی دیا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ اسے بیٹھنے کو کہہ چکا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی۔

"اس رات جو کچھ آپ نے کہا تھا کیا وہ صحیح تھا؟" وہ سوالیہ انداز میں دیکھتی اپنے اور اس کے درمیان کی خاموشی کو توڑ گئی۔

"کیا کہا تھا میں نے؟" اس نے مدھم اور گہرے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

"نگین اور اپنے بچے کے متعلق۔" اس نے بھی اتنی ہی سنجیدگی سے کہا۔ اس نے دیکھا اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ کچھ پل کے لیے وہ اسے بے جان سا محسوس ہوا۔

"جاننا ضروری ہے۔" بالآخر اس نے پوچھا۔

"اس غیر ضروری شخصیت کے لیے اتنا ہی غیر ضروری ہے لیکن تصدیق میں کوئی حرج نہیں۔" اس کا لہجہ اسے بے انتہا تلخ لگا۔ لہٰذا وہ خاموش رہا اس کی خاموشی ہی اس کا جواب تھی اور یہ جواب ہاں میں تھا۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنے ساتھ کسی اور کی زندگی بھی تباہ کر دی ہے۔" کچھ لمحوں بعد اس نے سوال کیا۔

اس سوال میں اشارہ اپنی جانب تھا۔

"ایک کی نہیں باقی دو اور بھی ہیں۔" اس نے بنا رکے بنا جھجکے فوراً کہا۔

"جہاں تک تمہاری زندگی کا سوال ہے تو اسے تباہ کرنے والے میرے والدین ہیں میں بعد میں آتا ہوں۔ تمہیں یہاں تکلیف ہے۔ اس کا افسوس مجھے ہے۔ یہ تکلیف میں تمہیں جان بوجھ کر دے رہا ہوں یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا میرے والدین سوچ رہے ہیں یا تم تو یہ غلط ہے۔ میری زندگی ایک ڈھب اختیار کر چکی ہے۔ دل کو جتنا مرنا تھا وہ مر چکا۔ روح کو جتنا مردہ ہونا تھا ہو چکی۔ اب انہیں کسی بھی طرح سے زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تم نہ میں نہ میرے ماں باپ۔ میں سوچتا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب انسان میں ہوں پر تمہیں دیکھ کر اب مجھے لگتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب انسان تم ہو۔" وہ دیکھ رہی تھی۔ مسلسل باتوں کے دوران بھی اس نے ایک بار بھی گردن موڑ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے نیاز تھا یا اس کے عشق نے اسے بے نیاز کر دیا تھا۔

"جس طرح ہوائیں اپنا رخ بدل لیتی ہیں اسی طرح قسمت بھی پلٹا کھا لیتی ہے۔ اسی طرح اگر میری قسمت نے پلٹا کھایا تو آپ دیکھیں گے اس وقت میں آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت لگوں گی۔ آپ اچھے سے برے حالات کی طرف آئے ہیں اور میں انشاء اللہ برے سے اچھے حالات کی طرف آؤں گی۔ مجھے اللہ پر یقین ہے کہ وہ میرے دن پھیر دے گا۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اس کے سنجیدہ اور مضبوط لہجے پر کچھ ثانیے کے لیے وہ چپ رہا۔ پھر پہلی بار گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرے ساتھ رہ کر تم اچھے حالات کی طرف آؤ گی۔" اس کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔ جسے یکسر نظر انداز کر کے وہ برملا کہنے لگی۔

"میں نے آپ کا نام نہیں لیا۔ صرف اپنے بارے میں کہا ہے خوشی کسی ایک شخص سے مشروط نہیں ہے۔" اس نے لب بھینچ کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ باقی راستہ دونوں خاموش رہے۔

فاروق کی منگنی میں وہ بجھے دل سے شریک ہوئی تھی۔ کسی رسم میں میں مزا نہیں آیا تھا۔ جب دل کے دیپ بجھے ہوں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ منگنی روایتی انداز میں ہوئی تھی۔ رات گئے فنکشن ختم ہوتے ہی وہ دونوں واپس چلے آئے۔ جبکہ اس کی ساس وہیں تھیں۔

✡ ✡ ✡

رات کو کسی لمس کے احساس سے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ وہ اس کے پاؤں پر

دونوں ہاتھ رکھے بیڈ کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کی خوف زدہ نگاہوں میں جھانک کر وہ کچھ چونکتے ہوئے اپنے ہاتھ ہٹا چکا تھا۔

"میں سمجھا کہ یہاں نگین۔" وہ اس وقت مدہوش تھا۔ کمرے کی لائٹس روشن تھیں۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اس نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر رک کر بالوں میں ہاتھ پھنسا کر یکدم چلایا۔

"کہا تھا نا میں نے تم سے کہ یہاں مت آیا کرو۔ سمجھتی نہیں ہو تم۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے نکل جاؤ ابھی ابھی اس کمرے سے آئندہ، آئندہ اگر تم اس کمرے میں آئیں تو نکل جاؤ یہاں سے۔" وہ ایک بار پھر چلایا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ اس نے اسے کمرے سے نکال دیا۔ دروازہ بند کر کے وہ واپس کمرے میں جا چکا تھا جبکہ وہ دھیرے دھیرے دروازہ بجانے لگی تھی۔

"اس قدر ذلت بھری زندگی ہوتی ہے عورت کی۔" آنسو تسلسل سے جاری تھے۔

"پلیز عثمان دروازہ کھولو۔" اس نے روتے ہوئے کہا لیکن اس نے نہیں کھولا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے شدت سے روتے روتے گیسٹ روم میں آ گئی تھی۔ گیسٹ روم کے صوفے پر بیٹھ کر وہ دل کھول کر رونے لگی۔

"یا اللہ میری قسمت میں ایک نشئی تھا میں نے صبر کیا۔ میری قسمت میں ایک بد کردار انسان تھا میں نے صبر کیا۔ اس نے میرے ساتھ برا رویہ رکھا میں نے صبر کیا۔ اس نشئی بد کردار ظالم شخص کے لیے میرے دل میں نفرت نہیں یہ ناانصافی کیوں۔ کیوں میرے دل میں نفرت بیدار نہیں کر رہا۔ کیوں ڈال دی ہے اس کی محبت میرے دل میں۔ ایسے انسانوں سے تو لوگ نفرت کرتے ہیں۔ اگر اس کی جگہ میں یہ سب کرتی تو وہ کیا کرتا۔ کیا مجھ سے محبت کرتا۔ وہ بدلے میں مجھ سے بے پناہ نفرت کرتا۔ تو میں کیوں نہیں کر رہی۔ جو کچھ اس نے کہا اگر وہ سب میں کرتی تو کیا وہ مجھے رکھ لیتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جاتا۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جا رہی۔ یہ ناانصافی ہے میرے ساتھ یہ ناانصافی ہے۔ تو کیوں مجھے اس کی محبت میں مبتلا کر رہا ہے۔ کیوں نہیں نفرت پیدا کر رہا میرے دل میں کہ میں اس پر لعنت بھیج کر سارے معاشرے میں اپنے بہن بھائیوں خاندان والوں کی عزت کو پس پشت ڈال کر اسے چھوڑ کر چلی جاؤں۔ یہ ذلت بھری زندگی تو پل پل کی موت ہے۔ میرے دل میں محبت پیدا کی بھی تو ایسے شخص کی کہ جسے میری ضرورت ہے ہی نہیں۔ کیوں ہے ایسا؟" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

وہ رات گیسٹ روم میں کٹی تھی۔ صبح نماز پڑھ کر وہ باہر لان میں آ گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر ٹہلنے سے دل و دماغ کو سکون مل رہا تھا۔ رات جو کچھ ہوا تھا۔ اس پر قرار آنے لگا۔ یہ قرار ٹھنڈی گھاس دے رہی تھی یا جذبہ محبت۔ اسے محبت سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اسے اس محبت سے شدید ترین نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ محبت ذلت سے دوچار کرتی ہے۔ محبت خونی ہے۔ انسان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لے تو نکلنے نہیں دیتی۔ وہ بھی اس خونی شکنجے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اب کرتی تو کیا کہ اسے اس مدہوش بد کردار شوہر سے محبت ہونے لگی تھی۔

✲ ✲ ✲

"تم کیوں آئی ہو یہاں منع کیا ہے نا میں نے۔" دوسری رات وہ پھر نشے میں دھت کمرہ رہا تھا۔

"جاؤ یہاں سے۔" وہ دھاڑا تھا۔ وہ گھبرا کر کمرہ چھوڑ گئی۔ جب بیدار ہوئی تو صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ قضا نماز پڑھ کر وہ کچن میں آ گئی۔ ملازمہ اطلاع لے کر آئی تھی اسے کلثوم بلا رہی ہیں۔ وہ ناشتے کا خیال ترک کر کے ان کے پاس چلی گئی۔

"تم نے رات کہاں گزاری؟" کمرے میں جاتے ہی یکدم سے انہوں نے سوال کیا۔ صبح جب انہوں نے دیکھا کہ وہ نہیں جاگی دیر ہو رہی ہے تو انہوں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔

جواباً" دروازہ عثمان نے کھولا تھا انہوں نے اس کے متعلق پوچھا تو وہ کچھ خاموش سا رہا۔ انہوں نے اندر جھانکا۔

"کہاں ہے کیا باتھ روم میں۔" خود ہی سوال جواب کر کے وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ انہوں نے اس کے چہرے پر الجھن دیکھی تھی ایک عجیب سا اضطراب اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ اس اضطراب نے ماں کے دل میں کوئی انجانہ سا کھٹکا پیدا کر دیا۔

"کہاں ہے وہ؟" اب کی بار آواز کچھ تلخ سی تھی۔

"گیسٹ روم میں۔" اس نے دبی آواز میں کہا۔

"تم نے کمرے سے نکالا ہے۔" لہجہ کچھ سخت اور زہریلا ہو گیا تھا۔ وہ چپ رہا۔ پھر وہ ایک خشمگیں نگاہ ڈال کر گیسٹ روم میں چلی گئی تھیں۔ اب وہ اس سے اسی کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ وہ بہت فکر مند ہو گئی تھیں۔ ان کا بیٹا انہیں یہ دن بھی دکھائے گا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے آفس سے دیر ہو گئی تھی۔ وہ بے چینی سے ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے انتظار کی صلیب پر چڑھے تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے رسائل دیکھے تھے ٹی وی کھولا وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا۔ وہ خود کو انتظار سے روک رہی تھی۔ وہ خود کو سرزنش کر رہی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ صرف تین بول سے دل اس قدر حساس ہو گیا تھا۔ اتنی دوری کے باوجود وہ اس کے بے حد قریب تھا۔ اتھل پتھل جذبات بے چینی کو اور ہوا دے رہے تھے۔ اسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ تھم سی گئی۔ سکون کی ایک ٹھنڈی میٹھی لہر نے سارے وجود کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

"چائے لے آؤ۔" اسے دیکھے بغیر وہ کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے چائے دے کر وہ اپنے کمرے میں آئی دل بے چین کو قرار آتے ہی وہ بیڈ پر لیٹ کر خود کو چادر میں اچھی طرح چھپا چکی تھی۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ ایک گھنٹہ کی نیند لینا چاہتی تھی۔ اس لیے بے فکری سے سو گئی۔ اسے سوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی جب ملازمہ پیغام لے کر آئی۔ اس کی امی آئی تھیں۔ آدھی نیند نے سر میں ہلکا ہلکا درد شروع کر دیا تھا۔ کسل مندی سے اٹھ کر اس نے منہ ہاتھ دھویا پر شکن لباس پر ہاتھ پھیر کر شکنوں کو دور کر کے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ کر وہ کمرے سے نکلی۔ اس کی امی ڈرائنگ روم میں چھوٹی بہن اور بھائی کے ہمراہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

چھوٹی بہن اور بھائیوں کو پیار کر کے وہ باقی گھر والوں کے متعلق پوچھنے لگی۔ ماں کے تسلی بخش جواب پر وہ مطمئن ہو گئی۔

"تم اس کمرے میں کیوں تھیں۔ تمہارا کمرہ تو اوپر ہے نا۔" اس کی ماں کی تحیر بھری آواز پر کچھ پل کے لیے وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ یکدم سے اس کا دھیان اس طرف چلا گیا۔ وہ تو بھول بیٹھی تھی کہ وہ تو اب الگ کمرے میں ہوتی ہے اور اسے ایسے کسی سوال کا جواب بھی کبھی دینا ہو گا۔

"ہم نے کمرہ چینج کر دیا ہے۔" اس نے اپنے تاثرات حتی المقدور چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا۔ تمہاری ساس کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں میں انہیں بلاتی ہوں کسی ملازمہ سے کہہ کر۔" وہ اٹھ کر کچن میں گئی۔ کچھ دیر میں واپس چلی آئی۔ اس دوران ماں بیٹی کے درمیان ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی اثناء میں عثمان باہر سے آیا تھا۔ ساس کو دیکھ کر وہ ان کی طرف آ گیا۔

"وعلیکم اسلام۔" انہوں نے بڑی محبت سے جواب دیا تھا۔

"گھر میں خیریت ہے۔" اس نے کھڑے کھڑے ہی پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہیں سب خوش رہو۔" وہ دعائیں دیتی

بولیں۔ ملازمہ چائے لے کر آگئی تھی۔

"ایک کپ چائے میرے کمرے میں لے آؤ۔" ملازمہ سے کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے دیکھا تھا اس کی ماں کی نظریں عثمان کی پشت پر جمی تھیں۔ وہ اپنے سابقہ بیڈ روم میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے کچھ الجھ کر بیٹی کو دیکھا اسی وقت اس کی ساس چلی آئیں۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ان سے ملی تھیں۔ دونوں کے درمیان رسمی بات چیت ہونے لگی۔ وہ غائب دماغی سے سن رہی تھیں۔ ان کی بیٹی نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ وہ شدید حیرت میں گھری تھیں۔ اس حیرت میں خوف، ڈر، گھبراہٹ، تجسس سب پوشیدہ تھے۔ وہ جتنی خوشی سے وہاں آئی تھیں اتنی ہی طبیعت مکدر ہوگئی۔ اس کی ساس نماز کے لیے اٹھ گئیں۔ اس دوران انہوں نے براہ راست سوال کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

"جھوٹ کیوں بولا تھا تم نے۔" اس کی ماں کا لہجہ کافی ترشی اختیار کر چکا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں دراصل ان کی طبیعت......"

"مجھے صرف سچ سننا ہے۔" وہ تلخی سے بولیں۔

"میں جو آپ سے کہہ رہی ہوں وہی سچ ہے۔" اس نے بھی اعتماد سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تھی۔

"ٹھیک ہے تم مت بتاؤ میں تمہاری ساس سے پوچھتی ہوں۔" ماں کے لہجے سے غصے کی جھلک بخوبی دکھائی دی تھی۔

"یہ دونوں الگ الگ کمروں میں کیوں ہیں؟" ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ گھبراہٹ اور شرمندگی کے عالم میں انہوں نے بہو کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ ثانیے بعد نظریں واپس موڑ لیں۔

"میں آپ سے سب سچ کہوں گی" پھر انہوں نے سب کچھ بتا دیا۔

"میں نے تو یہ سوچ کر اس کی شادی کر دی تھی کہ حسین بیوی کو دیکھ کر وہ اس لڑکی کو بھول جائے گا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ ویسا ہی رہے گا۔" وہ خفت سے سر جھکائے دھیرے دھیرے وضاحتیں دے رہی تھیں۔

"ایک رسک کے سہارے تم نے میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی۔" ان کے خاموش ہوتے ہی امی گویا ہوئیں۔

"مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے کہ میں تمہاری تھی کون جس کے نفع نقصان کے بارے میں تم سوچتیں گلہ تو مجھے اپنی بیٹی سے ہے۔ جس نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائے رکھی۔ آپ نے تو جو کرنا تھا وہ کر لیا۔ اتنا بھی نہیں سوچا کہ ایک معصوم کی زندگی کو تباہ کر کے آپ کو ملے گا کیا؟ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں اپنی بیٹی کے نصیب کو کالے اندھیروں کے حوالے کر کے چین سے بیٹھی تھی۔" وہ شدت سے رو رہی تھیں۔

"یہ کیا کر دیا آپ نے کہ ہم سب کو زندہ درگور کر دیا۔ جب بیٹے پر یقین نہیں تھا تو اس کی شادی کیوں کی۔ اپنے فائدے کو سوچتے سوچتے ہمارے نقصان کے لیے اگر آپ ذرا سا بھی سوچتیں تو کبھی بھی اتنا برا ہرگز نہ کرتیں۔ بہت برا کیا آپ نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا۔" اشک ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔ ان کے ساتھ وہ دونوں بھی دھیرے دھیرے رو رہی تھیں۔ پاس بیٹھی بیٹی کو رونا اپنے آپ پر نہیں آرہا تھا۔ رونا اسے ماں کے دکھ اس کے غم پر آرہا تھا۔

جب وہ کمرے سے نکلا تو اس نے ان تینوں کو روتے دیکھا کہ ان پر ایک نظر ڈال کر وہ وہاں سے سیدھا نکلتا چلا گیا۔ اسے کسی بات کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے بے فکری اور بے نیازی سے وہ واک کر رہا تھا۔ اس نے ماں کو سمجھایا تھا۔ پر وہ نہیں سمجھی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے الجھن ہوئی تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھی تھی۔ اس نے اپنے لیے اس لڑکی کی بے چینی نوٹ کی تھی۔ محبت کی زبان جانتا تھا کہ وہ خود اس وادی عشق سے گزر چکا تھا۔ وہ لڑکی دھیرے دھیرے اس کی محبت میں گرفتار ہو رہی تھی اتنی ہی اسے اس کے وجود سے الجھن ہو رہی تھی۔ اسے عشق و محبت سے الجھن ہونے لگی تھی۔ عشق

سے سوائے دردِ دل کے کچھ نہیں ملتا۔ وہ عشق سے گھبرانے لگا تھا۔ وہ جتنا اس کا خیال رکھتی وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک مہینہ بھی نہ رہ پائے گی اسے چھوڑ کر چلی جائے گی پر اس کا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ان کے پاس موجود تھی بلکہ اس کی محبت میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پچھلے کچھ دنوں سے شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ ہر چیز آگ اگل رہی تھی۔ جون کی تپتی دوپہریں جسم کو جھلسا کر رکھ دیتی تھیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے بارش بند تھی ہوا نے بھی اس علاقے کا رخ نہیں کیا تھا۔ درخت مرجھائے دھوپ کی تمازت سے شکستہ نظر آ رہے تھے۔ مٹیالی زمین دھوپ کی تپش سے تپ کر کندن بن گئی تھی۔ شدید گرمی کے باعث گھر سے نکلنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ رات کو ہی تھوڑا بہت گھوما پھرا جا سکتا تھا۔ لوگ بارش کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ آج صبح سے ہی موسم کچھ ابر آلود سا ہو گیا تھا۔ بادل اکا دکا نظر آ رہے تھے۔ دوپہر تک بادلوں نے پورے علاقے کو گھیر لیا تھا۔ تازہ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ اس دھیمی ہوا کی رفتار میں تیزی آ رہی تھی۔ اور پھر ہوا کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے۔ تیز آندھی سے سارا علاقہ مٹیالی دھند کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ گرد آلود ہوا اپنے ساتھ ساری مٹی اٹھا کر اسے بکھیرنے لگی۔ برآمدے کی سیڑھی پر کھڑی وہ اس تیز آندھی میں بارش کی امید لیے آسمان پر پھیلی دھند کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا اپنے ساتھ سب کچھ اٹھائے چل رہی تھی۔ ریت بکھر کر ہوا کے دوش پر فضاؤں کی زینت بنی جانے کہاں کہاں کی سیر کر رہی تھی۔ کچھ ریت اس کی آنکھوں میں چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دوپٹے سے صاف کرنے کی کوشش کی تو اس سے اور زیادہ جلن بڑھ گئی۔

"دھولو۔ اس سے صاف نہیں ہوں گی۔ ایسی تیز آندھی میں یہاں کھڑے ہونے کی کیا تک ہے۔" اس کی آواز پر بے ساختہ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ بے شکن لباس بے ترتیب بالوں سمیت اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا اس کے پاؤں میں بلیک سلیپر تھے۔ آستینیں کھلی ہوئی تھیں گریبان کے اوپری دو بٹن بھی کھلے ہوئے تھے اس کی آنکھیں اب بھی خوابیدہ سی دکھائی دے رہی تھیں۔ یکدم سے ٹھنڈی تیز ہوا چلنے لگی۔

"کہیں بارش ہوئی ہے۔ لگتا ہے یہ بارش برس کر رہے گی۔" وہ آنکھیں صاف کرتی جیسے خود سے بولی تھی۔

"کبھی کبھار بارش بہت بڑی تباہی لاتی ہے۔ یہاں تک کہ جان لے لیتی ہے۔" وہ بے خود سا ستون سے ٹیک لگا کر تھمنے والی آندھی کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ جو آنکھیں دھونے چل پڑی تھی اس کی بات پہ بے ساختہ مڑ کر دیکھنے لگی۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر اندر چلی گئی بارش زور سے برسنے لگی تھی۔ بادل گرجنے لگے فضا میں ایک شور سا بپا تھا۔ مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہر سو پھیل گئی تھی۔ درخت پودے ہوا کے دوش پر تیز تیز لہراتے ہوئے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بال لمبے اور گھنے کرتا ہے
ملنے کا پتہ: ۳۷، اردو بازار، کراچی

"عمر بھر کا ساتھ صرف اس صورت میں جب لڑکا لڑکی دونوں چاہیں۔ جبکہ یہاں صرف تم چاہتی ہو میں نہیں، میری زندگی خراب ہوئی تھی ہو گئی۔ تم اپنی زندگی کو برباد مت کرو۔ کیوں ان خود غرض لوگوں کے لیے اپنی زندگی کو تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔ جانتے بوجھتے ایک غلط آدمی کے ساتھ خود کو تباہ کر رہی ہو۔ ایک ایسا آدمی جو نشے کی حالت میں بالکل جانور بن جاتا ہے۔" اس کے خاموش ہونے پر وہ گویا ہوئی تھی۔

"ایک دفعہ یہاں آچکی ہوں اب یہاں سے نہیں جا سکتی۔ اگر جاؤں گی تو بہت کچھ سہنا پڑے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں یہیں سب سہہ لوں پلیز ہیں۔"

"میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نشے کی حالت میں مجھ سے جو کچھ ہو جاتا ہے۔ اگر تم اسے ساری زندگی برداشت کر سکتی ہو تو بے شک رہو۔ تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس اب جاؤ۔" اس نے دو ٹوک بات کر کے اسے جانے کو کہا تھا۔ وہ اٹھ گئی۔

بہت دنوں بعد یمی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر اداسی کی وہ کیفیت چھٹ گئی تھی جو پچھلے کچھ دنوں سے چھائی تھی۔ وہ اس کی چچا زاد بہن اور بہت اچھی دوست تھی۔ وہ دونوں کچن میں تھیں۔ وہ اس کے لیے کباب تل رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ باؤل میں کھیر ڈال چکی تھی۔ ٹرے میں کیچپ کی بوتل باؤل میں رکھ کر وہ پھر سے کباب کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"تم اس کے لیے خود کو تباہ کر رہی ہو یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ وہ ٹھیک ہونے والا نہیں ہے۔ عادت کبھی نہیں بدلتی۔ وہ عادی ہے نشے کا۔ تمہاری امیدیں فضول ہیں۔ یہ میں کل بھی کہتی تھی اور آج بھی کہتی ہوں اور کل بھی کہوں گی۔" اس نے بڑی بے باکی سے خیال آرائی کی تھی۔

"عادت بدل سکتی ہے فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ مجھے امید نہیں ہے۔ لیکن میں ناامید بھی نہیں ہوں۔ میں یقین اور بے یقینی کے دلدل میں نہیں پھنسنا چاہتی۔ پر جانے کیوں یہاں سے جانا اسے چھوڑنا میرے لیے ایک تکلیف دہ امر ہے۔" وہ کچھ پل کو رک گئی تھی۔

"شادی بار بار ہو سکتی ہے۔ پر دل کو روگ بار بار نہیں لگا کرتا۔ مجھے نہیں پتہ کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں یا عشق۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اسے پسند کرتی ہوں یا ناپسند۔ لیکن مجھے یہ خبر ضرور ہے کہ مجھے اس کا انتظار رہتا ہے۔ مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اسے دیکھے بنا دل کو بے چینی لاحق ہوتی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیتی ہوں تو قرار کی ٹھنڈی میٹھی لہر سارے وجود میں دوڑنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی لگتا ہے کہ میں بھی نشہ کرنے لگی ہوں۔ اس کے انتظار کا نشہ۔ اس کی دید کا نشہ۔ اب تو ہر وقت میرے حواس پر صرف اس کا نام ہی چھایا رہتا ہے۔ دنیا میں کچھ اور بھی ہے۔ دنیا میں کوئی رعنائی ہے سب بھول بیٹھی ہوں۔ بیویاں شوہر سے سکھ پانے پر صابر و شاکر ہوتی ہیں میں تو اس کی طرف سے ملنے والے ہر دکھ پر صابر و شاکر ہوں کتنا فرق ہے نہ مجھ میں۔ اس کے نام سے میں خود کو الگ نہیں کر پا رہی۔ اس کے نام بنا میرا نام کچھ نہیں ہے۔ میں ادھوری ہوں۔ اگر اس کا نام ہٹ گیا تو میرا زندہ رہنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔"

"یہ سب فضول ہے۔" اس کے خاموش ہونے پر یمی نے بات جاری رکھی تھی۔ "ایک نئی زندگی شروع کرتے ہی تمہارے سر سے یہ وقتی بھوت اتر جائے گا۔" وہ اسے لتاڑ رہی تھی۔ اس کی سفاکی پر بنا احتجاج کیے وہ اسی کھوئے انداز میں کہنے لگی۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں وہ جس کمرے میں رہتا ہے۔ مجھے اس کمرے سے محبت ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس سرنج کی قسمت پر رشک آتا ہے جو اس کے بازو میں قرار کی چند بوندیں منتقل کر کے اس کی نظروں میں اپنی اہمیت بڑھاتا ہے۔ وہ کس محبت سے سرنج کو دیکھتا اسے استعمال کرتا ہے۔ مجھے سرنج کی قسمت پر رشک آتا ہے۔" یمی اسے تکتی رہ گئی تھی اس کی آنکھوں سے بہنے والی نمی اس کے گالوں کو گیلا کر رہی تھی۔ اس کی بھیگی رندھی آواز پر وہ گم سی رہ گئی۔

"وہ کسی اور کے عشق میں پاگل ہے اور میں اس کے لیے۔ مجھے نہیں پتہ میں نہیں چاہتی پر ایسا ہو رہا ہے۔ جتنی تذلیل وہ میری کرتا ہے اتنی تذلیل کے باوجود کیوں یہ دل اس کی جانب مائل ہے۔ صرف تین بول تھے؟ یا میری بد قسمتی یا اس شخص کی خوش قسمتی کے اس قدر گناہ آلود زندگی بسر کرنے کے باوجود اسے اپنی بیوی سے اس قدر سچی محبت مل رہی ہے۔ ہر معاملے میں عورت ہی بد قسمت کیوں ہوتی ہے۔ میرے ماں باپ اب یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میری زندگی میں داخل ہونے والے اس پہلے مرد کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ تم بھی میری طرح یہ مان لو کہ قدرت اس پر مہربان ہے۔ اس کا ساتھ دے رہی ہے۔" وہ شدت سے رونے لگی۔

"میرے دل میں ایک لوز کریکٹر مرد کی محبت جگا کر قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر چلی بھی جاؤں تو اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں یہ فرق مجھے پڑے گا۔ میری ساری زندگی سسکتے ہوئے گزرے گی۔ اگر یہاں سسکتے گزر رہی ہے تو کیا برا ہے کہ یہاں میری محبت تو ہے۔ میرا دل اس بنا کہیں نہیں لگتا۔ میں اتنی ہی بے بس ہوں جتنا کہ وہ۔" ان کی باتوں کا سلسلہ اس کے آنے پر یکدم رک گیا تھا۔

"امی کہاں ہے؟" ان دونوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس نے براہ راست امی سے سوال کیا وہ اپنے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے فوراً گردن موڑ کر بولی۔

"وہ شاہ زیب چچا کے ہاں گئی ہیں۔" وہ جانے لگا تھا جب یمی نے آواز دے کر اسے روکا۔

"میری بات سنیں پلیز۔" وہ متعجب سا پلٹ کر اسے تعجب خیز نگاہوں سے سوالیہ انداز میں تکنے لگا۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ اگر آپ کچھ وقت دیں۔" وہ جو ان دونوں کو الجھن زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ فوراً تیز تیز قدموں سے اس کے پاس سے گزر کر نکلتی چلی گئی تھی۔

"جی کہئے۔" اس نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔

"اگر بیٹھ کر بات کریں تو بہتر ہوگا۔" یمی نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے دیکھا دیکھی وہ بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اپنی سوالیہ نگاہیں اس نے اس پر جما دی تھیں۔

"کہو کیا کہنا ہے؟" دونوں ہاتھ سینے پر جمائے وہ نظریں نیچی کر کے ہمہ تن گوش تھا۔

"میں آپ سے دو ٹوک بات کروں گی۔" سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے وہ بولی تھی۔ "آئیں بائیں مجھے نہیں آتی سیدھی سیدھی بات کروں گی۔ اگر آپ کو بری لگتی ہے تو اس کے لیے پیشگی معذرت۔" وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ اس وقت خشک سا لگا تھا۔

"آپ جانتے بوجھتے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر رہے ہیں۔" اس نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"لڑکی کی بات بعد میں آتی ہے پہلے میں اپنی زندگی تباہ کر رہا ہوں۔" اس کے صاف جواب پر وہ کچھ تلملائی تھی۔ پھر بات مزید جاری رکھتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ اپنی زندگی کیوں تباہ کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو نہیں لگ رہا کہ پہلے آپ ایک گناہ کے مرتکب تھے اب آپ کے سر دگنا عذاب ہے۔ اول تو آپ کو شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اگر کر بھی لی تو اب اسے نباہنے کے لیے خود کو کسی حد تک تو سدھار سکتے ہیں نا۔" لڑکی کا قہر آلود لہجہ اس کے غصہ کو ظاہر کر رہا تھا۔

"شادی میں نے اپنی مرضی سے نہیں کی۔ جنہوں نے کروائی ہے آپ ان سے کہیں جب وہ جانتی ہے کہ میں نہیں سدھر رہا تو اسے مجھے چھوڑ کر چلے جانا چاہیے۔ یا پھر اس بھیانک زندگی کو سہنا چاہیے۔ اگر وہ سہہ رہی ہے تو اس میں سراسر اس کا اپنا قصور ہے۔"

"تم اسے کیوں چھوڑ نہیں رہے۔" اس نے زہریلے انداز میں کہا تھا۔

"میں کیوں نہیں چھوڑتا۔" وہ جیسے خود سے سوال کرتا بولا۔ کچھ پل وہ یونہی خاموش سا رہا پھر بولا۔

"جب میں نے مرضی سے قبول نہیں کیا تو چھوڑتا

بھی میرے اختیار سے باہر ہے۔ وہ میری پرابلم میں برابر کی حصے دار ہے۔ میرے ماں باپ مجھے ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ وہ مجھے نہیں چھوڑ رہی اپنے ساتھ ظلم کر رہی ہے۔" وہ مستحکم آواز میں بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نہیں بدل سکتے۔ آپ یہ سب جو کر رہے ہیں ترک نہیں کر سکتے۔" اس نے سرد و خشک لہجے میں کہا تھا۔

"دیوانے سے مت پوچھو کہ دیوانگی کیا ہے۔" وہ بوجھل آواز میں کہہ گیا تھا۔

"اگر میں سدھر سکتا تو کم از کم اپنے لیے ضرور سدھرتا۔ مجھے خود پر ترس نہیں آتا کسی اور پر کیا آئے گا۔" کرسی کھینچ کر اٹھتے ہوئے وہ بولا اور بنا مزید کچھ کہے چلا گیا۔ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اس نے اسے بے چینی سے ٹہلتے دیکھا۔ ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یمی کچھ پل بعد اس کے پاس آئی تھی۔

"میں اب بھی کہوں گی کہ اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچو یہ کھیل نہیں ہے۔ مذاق نہیں ہے۔ باقی تم خود سمجھ سکتے ہو۔" یمی کے چہرے پر نا امیدی کے۔ شکست کے آثار تھے۔ اس کے جانے کے بعد وہ دیر تک ان کے مابین ہونے والی بات چیت پر سوچتی رہی۔

✸ ✸ ✸

وہ ناشتا کرنے کچن میں آیا تھا۔ اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ ملازمہ سے کچن صاف کروا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے اس سے ناشتے کے بارے میں پوچھا۔

"جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔" کرسی کھینچتے ہوئے وہ بولا۔ ملازمہ برتن دھو رہی تھی پٹخ پٹخ کر سر میں ہلکا سا درد محسوس ہوا تو وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

"ابھی رہنے دو بعد میں دھونا۔" ملازمہ گھبرا کر چلی گئی۔ آملیٹ کے لیے وہ تیزی سے پیاز کاٹ رہی تھی کہ جلدی کے باعث انگلی کٹ گئی تھی۔ خون ابل پڑا تھا۔ چوٹ گہری تھی۔ درد کی ٹیس اٹھی تھی۔ وہ سر جھکائے ٹیبل پر انگلی سے طبلہ بجا رہا تھا۔ اسے کچن میں سے پٹی لگاتے دیکھ کر وہ چونک کر اٹھا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ اپنی جگہ جم کر کھڑی ہو گئی۔

"میری فلائٹ مس ہو رہی تھی جو اتنی جلدی تھی تمہیں۔" وہ بھول گیا تھا کہ اس نے خود اسے جلدی کا کہا تھا۔ وہ خاموش تھی اسپرٹ سے زخم صاف کرنے کے لیے روئی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"زخم گہرا ہے۔"

"ہاں پر اس زخم سے ہرگز نہیں جو تم نے دیا ہے۔" وہ دل میں بولی تھی۔ وہ روئی کی مدد سے اسپرٹ لگانے لگا۔ زخم میں جلن ہوئی تو اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اسے کچھ پل گھورنے کے بعد بنا کچھ کہے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلی پر اسپرٹ لگانے لگا تھا۔

پھر زخم کی بینڈیج کی۔ وہ ہاتھ پر لگے زخم کو بھول گئی۔ وہ سامنے کھڑے مرد کی اس مہربانی و عنایت پر کھڑی حیران ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں اپنی انگلی کی بجائے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ان کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا۔ لیکن اسے ہمیشہ اپنے اور اس کے بیچ کوئی فاصلہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے بے حد قریب تھا یہی اطمینان ہی تو تھا جو اسے یہاں رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس لیے تو وہ اتنی مطمئن تھی کہ وہ ہمیشہ اس کے قریب رہا تھا۔ بینڈیج کرنے کے بعد وہ اس سے بولا۔

"ناشتا رہنے دو میں آفس میں کر لوں گا۔" وہ چلا گیا تھا۔ آج کا دن اس کی زندگی کا حسین ترین دن تھا۔

✸ ✸ ✸

وہ چائے لے کر آئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹا میگزین پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ کچن سے نکلی تو اس نے اسے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے دیکھا۔ کھانا کھانے کا ارادہ ترک کر کے وہ عشاء کی

نماز پڑھنے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ساس سسر دونوں ڈیرہ اسماعیل خان گئے ہوئے تھے۔ گھر پر وہ دونوں ہی تھے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر جب وہ واپس آئی تو وہ ڈرائنگ روم میں نہیں تھا۔ وہ اس کے پاس اس کے کمرے میں آئی تاکہ کھانے کے بارے میں پوچھ سکے ۔ لیکن وہاں کچھ اور ہی حالت تھی۔ آج وہ پھر جشن کے موڈ میں تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اب وہ کھانا نہیں کھائے گا اس لیے بنا کچھ کہے وہ واپس مڑی تھی۔

"یہاں آؤ۔" "اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے۔" وہ اس کے کمرے سے نکل آئی۔ آج کل جب وہ نشے کی حالت میں ہوتا تھا تو وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ تاکید اس کے سسر کی جانب سے بھی تھی۔ کھانے کا اس کا اپنا موڈ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ اس لیے اپنے کمرے میں آکر کتاب پڑھنے لگی۔ اسے کتاب پڑھتے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب وہ اس کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھ کر وہ گھبراہٹ کا شکار ہوئی۔

"میں نے تم سے کہا بھی کہ مت جاؤ۔ بیٹھو یہاں پر تم چلی گئیں تم...... تم ویسے نام کیا ہے تمہارا۔" وہ بے خودی سے لہجے میں کہتا اس کا نام پوچھنے لگا تھا۔ وہ ایک مجروح پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتی بولی تھی۔

"رابیلہ۔"

"رابیلہ بہت اچھا نام ہے تمہاری طرح پر تم اچھی نہیں ہو۔ تم تو بات بھی نہیں سنتیں۔ بندہ کبھی نہ کبھی تو کسی کی بات سن لیتا ہے۔ تم تو اتنی مغرور ہو کہ دوسرا دیکھتا رہے تم پر اثر ہی نہیں ہوتا۔" وہ متواتر بولتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اتر کر خوف و گھبراہٹ کے عالم میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی آئیں۔ کیا میں جنگلی ہوں جو تمہیں کاٹتا ہوں۔ سانپ ہوں اژدھا ہوں کیا ہوں۔" وہ اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سر کو اٹھاتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے دیکھتا بولا تھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ خوف زدہ آواز میں بولی تھی۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے جھوٹے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ میں نے تو کبھی بھی تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ تم جھوٹ بول کر میرے دل کو ٹھیس پہنچا رہی ہو۔" اس نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگی تھی جب اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

"ماروں گا تو نہیں نا تمہیں جو اتنا ڈرتی ہو میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم کیوں نہیں مجھے سننا چاہتیں۔ کیا میں بہت غلط بولتا ہوں۔ غلط آدمی کی بات سننا گناہ ہے کیا؟ ٹھیک ہے آج کے بعد میں گونگا بن جاؤں گا۔ پر تم تو مجھ سے بولا کرو نا۔ تم تو گونگی نہیں ہو گونگا تو میں ہوں۔ میں تو بول بھی نہیں سکتا۔ میں تو اپنی مرضی سے بول بھی نہیں سکتا۔" وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔ فرار کی کوئی راہ نہ پا کر اس نے موقع محل سے سمجھوتا کر لیا تھا وہ نہایت پر سکون ہو کر اسی پُرسکون آمیز انداز میں اپنا ہاتھ چھڑا کر کہنے لگی تھی۔

"میں آپ کی بات سن رہی ہوں۔ جو کچھ بھی کہنا ہے کہہ ڈالو۔"

"تم تو حکم چلانے لگیں۔ تم بھی حاکم بن رہی ہو حکومت کرنا چاہتی ہو مجھ پر۔" بالوں میں ہاتھ پھنسائے وہ دکھی لہجے میں بولا تھا۔

"جو زندگی آپ جی رہے ہیں اس سے بہتر تو موت ہوتی ہے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کس قدر بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ موت سے ڈر نہیں لگتا آپ کو۔ اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ کل کو اپنے رب کے سامنے آپ کیا منہ لے کر جائیں گے؟ اپنے آپ پر بیتنے والے یہ فضول گھسے پٹے واقعات سنا کر بہانے بنا کر آپ خود کو سزا سے بچا پائیں گے؟ آپ کو ایک لڑکی سے محبت تھی۔ اس کی شادی کہیں اور ہوئی پھر آپ کو ایک اور لڑکی سے محبت ہوئی یہاں تک کہ وہ محبت پھر اور شکل اختیار کر گئی۔" پھر تصحیح کرتی بولی تھی۔ "گناہ کی شکل اختیار کر گئی۔ پھر آپ اس لڑکی کے لیے اپنے ماں باپ دین و دنیا سے پھر گئے۔ اپنی زندگی کو آسان بنانے کے لیے اپنے آپ کو ہر تکلیف سے بچانے کے لیے کیا خوب صورت جواز پیدا کیا ہے آپ

نے۔ قیامت کے دن آپ کہیں گے کہ مجھ پر بہت تکلیفیں پڑی تھیں۔ دنیا کا پہلا اور آخری انسان جو تکلیفیں اٹھا اٹھا کر خود ایک تکلیف بن گیا تھا۔ دنیا کے پہلے انسان نے اگر ان تکلیف سے چھٹکارا پانے کے لیے یہ سب کیا تو اس میں اس کی کوئی خطا کوئی گناہ نہیں اور نہیں بخش دیا جائے گا۔ تم تو دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو گئے۔ یہاں بھی اپنی مرضی سے جیے اور وہاں بھی تم پر کوئی پابندی نہیں۔ کل تو خوش قسمتوں سے۔" وہ شدید طنز کرتی بولی۔

"اس بات پر خوش مت ہو کہ تمہاری پسند سے شادی نہ کروانے پر آپ کا باپ جہنم اور آپ جنت کے اہل ٹھہرائے جائیں گے۔" پچھلے پونے دو سال کا سارا غبار اس نے آج نکالا تھا۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھا تھا۔ سر جھکائے وہ خاموشی سے اسے سنتا رہا تھا۔ اس دوران اس نے ایک بار بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کچھ لمحوں بعد سر اٹھا کر وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا۔ وہ پرسکون سی اپنی جگہ کھڑی رہی تھی۔ اس پل اسے اس سے ذرہ بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو جو زندگی میں جی رہا ہوں میرے لیے اس سے موت بہتر ہے اس کا احساس مجھے نہیں ہے۔ موت یہ لفظ کتنا بھیانک ہے جانتی ہو۔ جو زندگی تم جی رہی ہو اس سے بھی تو موت بہتر ہے۔ تم نے خود کو کیوں نہیں مار لیا۔ کہنے میں کتنا آسان ہے کہ موت بہتر ہے۔ مار دو خود کو مار دو۔" وہ ترشی سے چلایا۔

"جو زندگی میں جی رہا ہوں میں خوش ہوں اس سے۔" کچھ پل بعد گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا تھا۔ "موت اس زندگی سے ہزار گنا بہتر ہے جو میں جی رہا ہوں۔ خود سے موت مجھے نہیں آئی۔ خود کو میں مار نہیں سکتا۔ پوچھو کیوں؟" وہ چلایا تھا۔ "اس لیے کہ موت سے بڑا ڈر لگتا ہے مجھے۔ میں خود کو نہیں مار سکتا۔ تم مار سکتی ہو خود کو؟ خود کو مارنا آسان کام ہے۔ بڑی ہمت چاہیے اس کے لیے۔ جو مجھ میں نہیں ہے۔" وہ رونے لگا۔

"تم خود کو مار رہے ہو۔ جو نشہ تم کر رہے ہو اس سے تم خود کو مار رہے ہو۔" اس نے دھیرے سے کہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تھا۔ "یہ بھی ایک خودکشی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں تم خود کو دھیرے دھیرے مار رہے ہو۔" وہ اسے ملائمت سے سمجھا رہی تھی۔ "ایک ہی وار میں خود کو مارنا میرے جیسے بزدل آدمی کے لیے آسان نہیں ہے۔" اپنے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ کہہ گیا تھا۔

"نہ میں مر سکتا ہوں نہ انہیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔" وہ یاسیت بھرے انداز میں بولا تھا۔ "میں ان کی ایک ہی اولاد ہوں۔" وہ بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر میں انہیں چھوڑ کر چلا جاتا تو ساری دنیا مجھ پر تھوکتی کہ وہ دیکھو ماں باپ کا ایک ہی بیٹا تھا گھٹیا سو انہیں بڑھاپے میں ایک عورت کے لیے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ تھا نا سفید خون ایک عورت کے لیے اس نے اپنی جنت کو ٹھکرا دیا۔ اسی بات کا تو پابند ہو کر رہ گیا تھا میں۔ میں اس عورت کے لیے انہیں چھوڑ نہیں سکا۔ اس عورت کے لیے اتنی بڑی بدنامی مول نہیں لے سکا۔ ہر ایک مجھ پر تھوکتا کہ ماں باپ نے کس محبت سے اسے پال پوس کر بڑا کیا اور اس نے انہیں انعام میں ذلیل و خوار کیا۔ میں بہت گھٹیا ہوں پر اتنا گھٹیا نہیں بن سکا تھا کہ لوگ نا خلف اولاد کے طور پر میرا حوالہ دیتے۔ خود کو مار نہیں سکا۔ انہیں چھوڑ کر میں نہیں جا سکا۔ تم بتاؤ کیا کرتا میں۔" وہ رو رہا تھا۔ قصور کس کا تھا وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ اگر جانتی تھی تو یہ کہ سامنے بیٹھا مرد رو رہا تھا۔ وہ دکھی دکھتا تھا۔ وہ بہت اداس تھا۔ یہی جانتی تھی وہ۔ اسے کسی بھی بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ اگر کسی بات سے غرض تھی تو وہ سامنے بیٹھا مرد تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ اس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ درد محسوس کر رہی تھی۔ یہ درد اس کے عشق کی ناکامی پر نہیں تھا۔ بلکہ اس مرد کی تکلیف پر

رلانے والا تھا۔ وہ عورت اس مرد کے آنسوؤں کے لیے رو رہی تھی۔ اس رات اس عورت کے دل میں اس مرد کے لیے کچھ محبت اور بڑھی تھی۔

✲ ✲ ✲

"آج شام کو تیار رہنا۔ ظفری نے ہماری دعوت کی ہے۔ ان کے گھر پارٹی ہے۔ تمہیں خاص طور پر بلایا ہے اس کی بیوی نے۔"

پارٹی میں شرکت کے لیے اسے سوائے بوریت کے کچھ نہیں ملا تھا۔ وہ اسے وہاں لا کر بھول گیا تھا۔ خود دوستوں میں مصروف وہ اس کی ذات سے قطعی لاعلم تھا۔ وہ ایک کونے والی چیئر پر بیٹھی باہر لان میں اس چہل پہل گہما گہمی کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں موجود سب لوگ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ سوائے ان دو ہستیوں کے۔ اس چکا چوند میں ہوتے ہوئے بھی وہ نہیں تھی۔ تیز روشنیوں نے آنکھوں میں دل و دماغ میں بجائے رونق پیدا کرنے کے ایک عجیب سی چبھن پیدا کر دی تھی۔ اسے اس ماحول سے یکدم سے گھٹن محسوس ہوئی تھی۔ فضا میں دھیمے انداز میں رچا بسا میوزک کسی وزنی ہتھوڑے کی ضرب کی مانند سنائی دے رہا تھا۔

کچھ دیر میں کھانا سرو ہونے لگا۔ وہ اس کے پاس چلا آیا وہ ارد گرد پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہی تھی۔ ظفری کی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ یہ پارٹی اپنی شادی کی خوشی اور اور ایک اچھی جاب کے سلسلے میں اس نے دی تھی۔ ظفری اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ وہ دونوں اسکول کالج سے ہی دوست چلے آ رہے تھے۔ یہ دوستی اب پہلے سے بھی زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی ادھر ادھر بھٹکتی نگاہیں گیٹ سے اندر آنے والے کپل پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ ایک نہایت ہینڈسم لڑکے کے ساتھ ایک اچھی شکل و صورت کی لڑکی کو دیکھ کر وہ اپنی نظریں پھیر چکی تھی۔ مسز سلطانی معذرت کر کے اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئیں۔ وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"کھانے کے بعد چلنا ہے یا میوزیکل پروگرام دیکھ کر جانا ہے۔" اس نے نوٹ کیا تھا اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے ہمیشہ اس کے ماتھے پر شکن ابھر آتی تھی۔ اس کے شکن آلود ماتھے پر سے نظریں ہٹا کر وہ بولی۔

"کھانے کے بعد چلتے ہیں پھر دیر ہو جائے گی۔" وہ سر ہلا کر رخ پھیر کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر میں کھانا سرو ہوا تو وہ دونوں کھانے کی ٹیبل کی طرف چلے گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ظفری کے پاس اجازت لینے چلا گیا۔ ظفری کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ ایک عورت تھی جس کی اس کی جانب پشت تھی اس لیے وہ اس کی شکل دیکھ نہیں پایا تھا۔

"شکر ہے تم آج آ گئیں ورنہ تو ہمیشہ بہانے بناتی ہو۔" ظفری بشاش لہجے میں اس عورت سے کہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی جب اس نے پہل کرتے ہوئے کہا۔

"ظفری اب میں جاؤں گا پاپا ناراض ہوتے ہیں دیر سے آنے پر خاص طور پر اس صورت میں جب بیوی بھی ہو میرے ساتھ۔" اس نے وضاحت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے چلے جاؤ میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔" ظفری نے کھلے دل سے اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑتا۔ اس عورت نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بھی بے ساختہ اس پر اٹھی تھیں۔ وہ اس پل بت بن گیا۔ آج کئی عرصے بعد اس نے اسے یہاں دیکھا تھا۔ وہ بھی حیرت سے دوچار تھی۔ پھر اپنی حیرت چھپائے ہوئے ظفری سے یکدم سے بولی۔

"نسیم میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں اس کے پاس جاتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ اس کی متعجب نگاہیں اس کی پشت پر جمی تھیں۔

کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے

بعد اس کی نگاہیں پلٹ کر ظفری پر آئیں۔

"یہ کون ہے؟ آئی مین کیا لگتی ہے تمہاری؟" اس الجھن میں اسے مناسب جملہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

"میری بیوی کی کزن ہے۔ پہلے کسی اور شہر میں تھی پچھلے دو مہینوں سے یہاں ہے اس کے شوہر کا ٹرانسفر ہوا ہے یہاں۔ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ میں اس کی جاب ہے۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ وہ رابیلہ کے پاس آیا تھا۔

"کچھ دیر بعد چلے جائیں گے۔" یہ کہتے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دیکھا دیکھی وہ بھی پھر سے بیٹھ کر لوگوں کی بھیڑ کو تکنے لگی۔ اس کی نظریں اسی لڑکی کی طرف اٹھی تھیں جسے اس نے ایک مرد کے ساتھ اندر آتے دیکھا تھا۔ وہ نارنجی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کا قد اس کی خوب صورتی کو بڑھا رہا تھا۔ اس کے نمایاں قد کے باعث اس کی توجہ بار بار اس کی جانب مبذول ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی تقلید میں جب اس نے سامنے دیکھا تو وہ اسے نظر آئی۔ وہ اب ان کے بالکل سامنے کھڑی اس کی بیوی کی نگاہوں کی زد میں تھی۔

"یہ انعم ہے۔" اس کی اپنی نظریں بجائے انعم کے اپنی بیوی کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کی بات پر اس کی نگاہیں پلٹ کر سوالیہ انداز میں کچھ پوچھنے لگیں۔

"یہ انعم ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے اس لیے میں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔" اس نے وضاحت بھرے انداز میں یہ جانے بغیر کہ اس کے دل پر اس کی بات سے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں نہایت سچائی سے کہا تھا۔

"یہ انعم ہے میری پہلی محبت۔" پھر استہزائیہ انداز سے ہنستے ہوئے بولا تھا۔ "پر وہ کہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ وقت گزاری یا دل لگی کرتا رہا ہوں۔ بزدل، مجبور، لاچار، عاشق۔ اسے نفرت ہے ایسے عاشق سے جو مجبور ہو۔ اس لیے وہ اب مجھ سے سوائے نفرت کے کچھ نہیں کرتی۔ محبت ختم۔" وہ کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا لیکن اسے تنہا دیکھ کر وہ یکدم اٹھتے ہوئے۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" کہتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔ انعم اسے اپنے پاس آتے دیکھ کر جانے لگی۔ اس نے سامنے آ کر اس کے جانے کا راستہ مسدود کر دیا۔

"میں تم سے صرف ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات کسی محبت یا عشق یا پرانی یادوں کو تازہ کرنے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات صرف اور صرف تمہارے حال سے متعلق ہے۔" اس کی گمبھیر آواز پر وہ بالکل چپ اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

"تم خوش تو ہو نا۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے سخت نظروں سے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"اگر مجھے لگتا تو میں تم سے کبھی بھی یہ سوال نہ کرتا۔" اس نے بڑے ملول انداز میں کہا۔

"تو پھر پوچھنے کی زحمت مت کرو۔ میں خوش رہوں یا اداس، اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ پر میری ایک بات یاد رکھنا کہ میں تمہاری بے وفائی کبھی نہیں بھولوں گی۔ اور نہ ہی اس کے لیے تمہیں معاف کروں گی۔" وہ ایک گہرا وار کر کے اب اسے سلگتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میری رہنے دو۔ پر لگتا ہے کہ تم بڑے خوش خوش جی رہے ہو۔" ذرا سا مڑ کر سامنے بیٹھی رابیلہ پر نگاہیں ڈال کر اس نے ایک بار پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اس لڑکی کے لیے تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ بڑے غضب کی بیوی لائے ہو۔ یہ تو بڑے بڑوں کے ایمان کو متزلزل کر سکتی ہے تم کیا چیز تھے۔" اس کا کاٹ دار لہجہ اسے کاٹتا چلا گیا۔

"کبھی کبھی مجھے بہت گلہ ہوتا ہے کہ جو شخص دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ دوسروں کو غم دیتا ہے وہ خود خوش کیسے رہتا ہے۔ اللہ اسے دکھوں سے غموں سے تکلیفوں سے دوچار کیوں نہیں کرتا۔ وہ عیش سے اسے جینے کیوں دیتا ہے۔ کیا اس کی نظر میں وہ بہت نیک ہوتا ہے۔ یا اسے ڈھیل دیتا ہے۔ جو بھی ہے۔ بس

میں تمہیں سسکتا دیکھنا چاہتی ہوں میری طرح میں چاہتی ہوں کہ تمہیں بھی ایسی بیوی ملے جو دن رات شک کر کر کے تمہارا سکون تمہارا سارا اطمینان یوں چھین لے جیسے کہ میرا چھینا گیا ہے۔ تمہاری زندگی ویسے ہی برباد گزرے جیسے میری گزر رہی ہے۔ یہی میرا ظرف یہی میرا ضبط ہے۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے میں تمہیں صرف بد دعا ہی دیتی ہوں۔" بھیگی آواز اور مغموم انداز میں کہتی وہ ہاتھ میں تھامے ٹشو پیپر سے آنکھوں میں آئی نمی کو جذب کرنے لگی تھی۔ پھر مزید کچھ کہے بنا وہ چلی گئی تھی اس لڑکی کے خاکستر کر دینے والے الفاظ اس کا قہر بھرا لہجہ اس کی بے پناہ افسردگی اس شخص کو مزید مضمحل بنا گئی تھی۔ اسکے الفاظ سے چھوٹی چنگاریاں اسے آئینہ میں اپنا آپ دکھا گئی تھیں۔ اسے شدید غلط فہمی لاحق تھی۔ وہ اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر جو کچھ بولی وہ یکسر غلط تھا۔

اس کی بد دعا تو اسے یوں لگی تھی کہ وہ نہ زندوں میں رہا تھا نہ مردوں میں۔ اس عورت کے تحقیر آمیز الفاظ نے اس کے شدید ذہنی ہیجان اور اس کی پژمردہ زندگی کے بھیانک نتائج کو ثابت کر دیا تھا۔ کیا حقیقی معنوں میں وہی اس کی خراب زندگی کا ذمہ دار ہے؟ یہ سوال ذہن کے نہاں خانوں میں ابھرا تھا۔ ساکت وجود کو حرکت کی ضرورت تھی۔ وہ جیسے خیالوں کی دنیا سے نکل آیا تھا۔ قدرے چونک کر وہ اردگرد نگاہ ڈال کر کچھ سوچتا اس کے پاس آیا۔

"چلو۔" وہ اس سے مخاطب تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اس وقت اس مرد پر خود فراموشی کا عالم طاری تھا۔ وہ عورت جانتی تھی کہ آج پھر وہ جشن منانے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج موسم معمول سے ہٹ کر تھا۔ حبس اور گھٹن میں کمی تھی۔ نرم دھیمی ہوا ٹھنڈی ہوا نے موسم کو کافی حد تک خوشگوار کر دیا تھا۔ کہیں بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہاں کے موسم میں بھی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ دھوپ کی شدت نہ ہونے کے برابر تھی شام کو سہیل صاحب اور متین چچا دونوں اپنی بچی اور والدہ سے بات کرنے آئے تھے۔ لیکن انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ملازمہ نے ان کی غیر موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

"وہ تو ہسپتال گئی ہیں۔" وہ مودب لہجے میں بولا۔

"کیوں؟ خیریت تو تھی نا۔" متین چچا نے فکر مندی سے سوال کیا۔

"چھوٹی بیگم صاحبہ کے ہاتھ پر چوٹ آئی تھی اس لیے۔" ملازم کا چہرہ فق ہوا تھا۔ انہوں نے نوٹ کیا۔

"کیسی چوٹ؟" باپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تبھی فکر انگیز انداز میں وہ تفصیل پوچھنے لگے۔

"جی پتہ نہیں۔ آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے لے آؤں۔" ملازم وہاں سے رفو چکر ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں پریشان و فکر مند بیٹھ گئے۔ دونوں اپنی سوچ میں گم تھے۔ ملازم چائے لا کر ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔ اسے جاتا دیکھ کر متین چچا نے پوچھا۔

"شمن کہاں ہے؟"

"جی وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔" ملازم کے جاتے ہی وہ دونوں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

"کیا کریں اس سے بات کریں یا ان کے آنے کا انتظار کریں۔" اپنے بھائی سے مشورہ کرتے ہوئے سہیل صاحب نے سوال کیا۔

"ابھی رہنے دو پہلے ان کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔" جانے کیوں انہیں کسی بات کے ہونے کا اندیشہ ہونے لگا تھا۔ یہ اندیشہ عبدالمتین چچا کو بھی لاحق تھا جس کا اظہار وہ اپنے بھائی کے سامنے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اپنی ساس کے ہمراہ آئی تھی۔ اس کی ساس ان دونوں کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئیں پھر گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے سلام کرتی باقی سب کی خیریت دریافت کرنے لگیں۔ جبکہ وہ پریشانی کے عالم میں کھڑی ان دونوں کو تکے جا رہی تھی۔ پھر چچا

کے کہنے پر بیٹھ گئی۔

"جھوٹ دکھاؤ۔" باپ کے سنجیدہ لہجے پر وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی جانے کیوں اس وقت کوئی بہانہ کوئی جھوٹ بولنا مشکل لگا تھا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ ساس پر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں چھپی رنجیدگی کو پڑھ کر وہ اپنے ہاتھ سے آستین کو الٹتے ہوئے اپنا بازو دکھانے لگی۔ بینڈیج ہونے کے باعث وہ زخم نہیں دیکھ سکے تھے۔

"کب ہوا زخمی؟" سہیل صاحب مضمحل نگاہ سے تکتے ہوئے بڑی بوجھل آواز میں بولے۔

"کل۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیسے ہوا؟" وہ باقاعدہ تفتیش پر اتر آئے تھے۔

"کچن میں کام۔"

"کچن میں کام کے دوران بازو کا اوپری حصہ کیونکر زخمی ہوا چوٹ ہاتھ پر لگنی چاہیے تھی بازو پر نہیں۔" سہیل صاحب برہم ہوتے ہوئے گویا ہوئے۔ وہ اس کے جھوٹ کو پکڑ چکے تھے۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"چاقو سے زخمی کیا ہے اس نے؟" وہ خاموش رہی تھی۔

"تم سے کہہ رہا ہوں چاقو سے زخمی کیا ہے؟" وہ دھاڑے۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"کہاں ہے وہ کمینہ؟" عبدالتین چچا بھائی کو اٹھتے دیکھ کر جلدی سے کھڑے ہو کر ان کے اشتعال کو کم کرنے کی خاطر کہنے لگے۔

"اتنے برہم کیوں ہو رہے ہو۔ تسلی سے بات کرتے ہیں۔" لیکن وہ بھائی کے اشتعال کو کم کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ وہ سیدھے عثمان کے کمرے کی جانب بڑھے۔ چچا اور اس کی ساس بھی ان کے پیچھے چلی گئی تھیں جبکہ وہ اپنی جگہ تھم سی گئی تھی۔ دھڑام سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گئے۔ وہ گھبرا کر دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ کمپیوٹر پر تصاویر دیکھ رہا تھا۔ انہیں کمرے میں آتے دیکھ کر وہ کمپیوٹر آف کر چکا تھا۔ اندر آنے والے کمپیوٹر کے مونیٹر پر کسی لڑکی کی تصویر دیکھ چکے تھے وہ آگے بڑھا آہستگی سے سلام کر کے انہیں متعجب نظروں سے تکنے لگا۔ کیونکہ آنے والوں کے تیور یکسر بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے سر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیتے ہوئے وہ نہایت ترش روئی سے بولے تھے۔

"خود کو کیوں نہیں مار ڈالتے۔ مرد ہو تو خود کو مار ڈالو۔ کہ یہ گھر ساری دنیا تم جیسوں سے پاک ہو جائے۔ میری بیٹی کو ہاتھ کیسے لگایا تم نے۔" وہ اسے ہاتھ سے دھکیل رہے تھے۔

"اس کا خیال رکھ نہیں سکے تو زخم کیوں لگانے لگے۔ کس حیثیت سے اسے مارتے رہے ہو۔ اگر شوہر کی حیثیت سے تو تم اس کے اہل ہو ہی نہیں۔" اس کے اس گہرے طنز پر وہ بلبلا تا یکدم سے ان کے ہاتھ روک کر سخت آواز میں چلایا۔

"میں آپ کا لحاظ کر رہا ہوں اس لیے آرام سے بات کریں۔" عبدالتین چچا اپنے بھائی کو کھینچ رہے تھے۔ جبکہ کلثوم اپنے بیٹے کو سمجھانے لگی تھیں۔

"میری بیٹی کو مارنے والا یہ ہوتا کون ہے۔ کوئی ایک خوشی اس نے اسے دی ہوتی تو بھی بات بنتی۔" وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلا رہے تھے۔

"نہیں ہے تمہاری بیٹی کی کوئی حیثیت۔ نہیں ہوں میں اس کا شوہر۔ کیا کر لو گے تم۔ لے جاؤ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ۔ کیوں بٹھا کر رکھا ہے تم نے اسے یہاں نہیں چاہیے تمہاری بیٹی مجھے۔ اگر یہاں رہے گی تو مار کھائے گی۔" شدید غصے کے عالم میں جو منہ میں آ رہا تھا وہ بک رہا تھا۔ اس کی بات پر وہ اپنا آپ چھڑا کر اسے مارنے کو آگے بڑھے تھے کہ عبدالتین چچا نے انہیں سختی سے جکڑ لیا۔ کلثوم ان کی منتیں کر رہی تھیں۔

"بھائی صاحب خدا کے لیے غصہ نہ کریں۔ ہم اسے سختی سے سمجھائیں گے آئندہ یہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔" ان بات کو قطعی نظر انداز کر کے وہ

اپنی بیٹی کو آوازیں دینے لگے۔ اسے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ ان کے پاس آتی۔ اس کا سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ ساری قوت گویا سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ باپ کی پکار پر وہ مردہ قدموں سے ان کے پاس چلی آئی تھی۔

"بیگ لو اپنا چلو ہمارے ساتھ۔" وہ تیز اور مضبوط لہجے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

"ابھی ابھی طلاق دو اسے۔" وہاں ایک سناٹا سا پھیل گیا تھا۔ ایک ایسا طویل سکوت طاری ہوا تھا جو قیامت کی مانند جان نکال کر رک گیا تھا۔ یہ الفاظ نہیں تھے تباہی کی المناک خبر تھی جو زندگی کی بچی رمق کو بھی ختم کرنے والی تھی۔ عبدالمتین چچا نے اپنے بھائی کو سمجھانا چاہا۔ لیکن ان پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

"طلاق دو اسے۔" وہ چلائے۔ کلثوم گم صم انہیں تکے جا رہی تھیں۔ پھر وہ روتے ہوئے ان کے پاس آکر بولیں۔

"ہم افہام و تفہیم سے بات حل کر لیں گے بھائی صاحب اس عمر میں مجھے دنیا کے سامنے شرمندہ نہ کریں۔ بس یہ دعا کریں کہ اسے موت آئے کہ خود بخود میری آپ سب کی جان چھوٹ جائے۔ مجھ سے میرا آخری سکون نہ چھینیں۔" وہ رو رہی تھیں۔

"یہ میری آخری امید ہے۔ خدا کے لیے بھائی صاحب۔" وہ غائب دماغی سے سب سن رہی تھی۔ جو بم اس کے دل و دماغ پر بلاسٹ ہوا تھا اس نے اس کے اندر زلزلے کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ شدید جھٹکوں کی زد میں تھی۔

"آپ کی مرضی الزام مجھ پر نہ آئے کہ طلاق میں نے دی۔" عثمان کے الفاظ سامنے کھڑی لڑکی کی روح کو قبض کرنے لگے تھے۔ "پہلے آپ ایک سادہ کاغذ پر لکھ کر دیں کہ طلاق آپ چاہتے ہیں پھر میں ابھی ابھی دے دیتا ہوں۔" اس کا پرسکون لہجہ اس لڑکی کو اتھاہ اندھیروں میں دھکیل گیا تھا۔

"تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوں کہ مکر جاؤں گا اور نہ ہی اس قدر گھٹیا ہوں کہ تمہارے جیسے گھٹیا انسان کے لیے اپنی بیٹی کو عدالتوں کے چکر لگواتا پھروں گا۔ بے فکر رہو اس دنیا کی عدالت سے۔ ہاں آخرت کی عدالت میں میں تمہیں ذلیل و خوار دیکھنا چاہتا ہوں طلاق دو۔" سہیل بہت مشتعل تھے۔ ان کے قطعی لہجے اشتعال انگیز انداز اور دہکتے لہجے نے اس کے فیصلے کو حتمی شکل دی تھی۔

"سنو۔" وہ اس کی جانب مڑا "یہ تمہارا باپ چاہتا ہے اس لیے میں یا میری فیملی خطاکار۔۔۔" وہ تیزی سے اس کے پاس آئی تھی۔ اس کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگی وہاں موجود ہر بندے پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اس مہیب سناٹے کو چیرنے والی اس کی آواز تھی۔

"مجھے نہیں چاہیے طلاق۔ خدا کے لیے مجھے طلاق مت دو۔ میں ساری زندگی تمہاری غلام بن کر رہوں گی۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ان کی باتوں پر مت جاؤ۔ یہ غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ تم سن رہے ہو۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف تمہارا نام چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ بہت خوش ہوں۔"

"اس کمینے کے لیے اپنی زندگی خراب کرو گی۔ چلو اٹھو۔" اس کے ابو غرائے تھے۔

"ابو نہیں میں نہیں جاؤں گی۔" وہ شدت سے روتے ہوئے کہنے لگی۔

"اٹھو۔" وہ چلاتے ہوئے اس کی جانب بڑھے۔ عبدالمتین چچا نے بھی بڑی نرمی سے کہا تھا۔

"دیکھو بیٹا ابھی ہمارے ساتھ چلو۔ تم جیسا کہو گی ہم ویسا ہی کریں گے۔ فی الحال تو چلو ہمارے ساتھ۔" وہ انکار میں سر ہلاتی بولی۔

"میں نہیں جاؤں گی مجھے نہیں رہنا ہے۔" اس کے ابو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

"چلو اٹھو۔" وہ اسے کھینچنے لگے۔ وہ روتے ہوئے مڑ کر تیز آواز میں اسے پکارتی بولی۔

"عثمان خدا کے لیے مجھے ان سے چھڑاؤ۔ میں

نہیں جاؤں گی۔" وہ خاموش کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔

"عثمان میں نہیں جاؤں گی۔" وہ شدت سے روتی اسے پکارتی چلا رہی تھی۔

"عثمان میں نہیں جاؤں گی عثمان۔" وہ چلا رہی تھی۔ خاموش وجود میں جنبش ہوئی۔ حواس قابو میں نہیں تھے۔ یا پھر جاگ گئے تھے یا پھر مردہ ہو گئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے قدم خود بخود ان کی جانب بڑھے تھے۔ ان کے قریب جا کر اس نے اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ نکالا۔

"تم نہیں جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔" بیٹی کی اس حرکت سے باپ کو شدید رنج پہنچا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر تم یہاں رہنا چاہتی ہو تو یہ جان لو کہ آئندہ تم میرے گھر نہیں آؤ گی اس گھٹیا کمینے کے پاس رہو۔ اگر یہ تمہیں جان سے بھی مار ڈالے تو اس سے بازپرس کرنے نہیں آؤں گا۔ مر گئی ہو تم میرے لیے۔ اس کمینے کے لیے آج تم نے اپنے باپ کو چھوڑ دیا۔ رہو اس ذلیل کے پاس۔" وہ کہتے ہوئے نکل گئے تھے۔ جبکہ عبدالمتین چچا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی تھی۔ پھر وہ بھی ان کے پیچھے نکل گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

کتاب ہاتھوں میں تھامے وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی کہ وہ کمرے میں آیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر یکلخت اٹھ بیٹھی۔

"ایک کپ چائے بنا کر لاؤ۔" یہ کہتے ہی وہ واپس پلٹا۔ وہ کچن میں آگئی ایک کپ چائے بنانے کے دوران سوچتی رہی تھی۔ آج جو کچھ ہوا تھا وہ اس پر غور کرنے لگی۔ آج جو اس نے کیا تھا وہ اسے بہتر لگا تھا۔ کیونکہ اسے یہ اندازہ بہت اچھی طرح تھا کہ وہ اس شخص کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ چائے بنا کر وہ اس کے کمرے میں آئی۔ وہ بستر پر اوندھا لیٹا تھا۔ آہٹ پر بھی اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ چائے رکھ کر جانے لگی جب اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے دبی آواز میں کہا تھا۔

"دروازہ بند کر کے یہاں آؤ۔" وہ کانپ اٹھی تھی۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ آیا وہ اسے مارنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ وہ خوف میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"مجھے نیند آرہی ہے مجھے جانا ہے۔" اپنا بہانہ اسے خود بودا لگا تھا۔ وہ کروٹ لے کر سیدھا ہوا۔

"دروازہ بند کر کے آؤ۔" اس کی تحکم بھری آواز پر وہ ایک بار پھر پریشان ہو گئی۔ پھر دل کو تسلی دیتی یہ یقین دلانے لگی کہ وہ اتنا ظالم ہرگز نہیں کہ اسے مار ڈالتا۔ ان دو سالوں میں اتنا تو وہ بھی جان گئی تھی۔

اسے یونہی جما دیکھ کر وہ خود اٹھ گیا۔ جنو ذاس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے وہ اس کے ہمراہ دروازے تک گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ دونوں واپس بیڈ کی طرف آئے۔ بیڈ کے کنارے اسے بٹھا کر وہ خود کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ متعجب خیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا اس نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ کچھ پل بعد آنسو بہنے لگے۔ کچھ پل دائیں بائیں دیکھنے کے بعد ایک بار پھر اس پر نظریں جما کر وہ کہنے لگا تھا۔

"جو کچھ پچھلے دو سالوں سے میں تمہارے ساتھ کرتا رہا ہوں اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ میں معافی کا اہل نہیں ہوں پر میں پھر بھی معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ میں نے برا کیا۔ سب کے ساتھ اپنے ساتھ۔" وہ رونے لگا تھا۔ "لیکن جتنا برا میں نے تمہارے ساتھ کیا اتنا برا تو میں نے اپنے ساتھ بھی نہیں کیا۔ تمہیں اذیتیں دے دے کر۔ تمہیں زخم دے دے کر۔ تمہارا صبر مجھے۔" وہ روتے ہوئے کچھ پل کو رکا تھا۔

"تمہاری شرافت تمہارا صبر مجھے کس عذاب سے دوچار کریں گے اس کا اندازہ مجھے ہونے لگا ہے۔ لوگ تو چیخ چلا کر ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ تم نے تو اپنا احتجاج اپنی محبت اور صبر میں لپیٹ کر آسمان کی وسعتوں کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ تم نے مجھے تباہ و برباد کر دینا چاہا۔ دین و دنیا دونوں میں خوار ہو کر رہ گیا میں۔ ایسے خواروں کو تو لوگ مزید خوار ہونے کے لیے چھوڑ

دیتے ہیں۔ تم نے تو میری جزا و سزا کا پورا بندوبست کر دیا۔ کیوں ایک خطاکار گناہ گار کے ساتھ رہنا چاہا۔ میں تو جی کر بھی خوار ہوا اور مر کر بھی خوار۔" اس نے اپنے ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے تھے اور اپنا سر ان پر ٹکا کے رو رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں معافی کے قابل نہیں ہوں تم چاہو تو مجھے معاف کر سکتی ہو۔ چاہے تو مجھے معاف نہ کر کے ساری زندگی کے لیے ایک بڑے عذاب میں مبتلا کر سکتی ہو۔ لیکن میں تم سے بار بار ہر بار یہی کہوں گا کہ مجھے معاف کر دو۔ جو کچھ میں نے کیا تمہارے ساتھ اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔" اس کے شدت سے بہتے آنسوؤں کو محسوس کرتے ہوئے وہ خود بھی آنسوؤں کے قطرے بہا رہی تھی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا تھا؟ کیا قدرت کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ کیا قدرت اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ کیا وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ اس مرد کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دکھ کے تھے۔ جبکہ پاس بیٹھی عورت کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خوشی کے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کے احساسات میں بھی کتنا تضاد تھا۔

"میں نے تمہیں معاف کیا۔" روتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر اٹھ گئی تھی۔

"میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے دعا کریں میرا باپ مجھے معاف کر دے۔" شدت سے آنسو بہاتے ہوئے اس نے دبی آواز میں کہا تھا ———— وہ جانے کو مڑی تھی لیکن وہ ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ اس کا ہاتھ عثمان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"میں نے ہمیشہ اپنے دکھ کو نشے سے رفع کیا پر آج" کچھ پل خاموش رہنے کے بعد وہ بہت مدھم لہجے میں کہہ گیا تھا۔ "آج کے بعد تم اس کمرے میں رہو گی۔" لائٹس آف کر کے وہ بیڈ پر دراز ہوا تھا۔ "آج کے بعد وہی ہو گا جو تم چاہو گی۔" اس نیم تاریکی میں اسے اس کی دھیمی آواز سنائی دی تھی۔ کچھ پل بعد اس نے اپنے ماتھے پر ایک احترام آمیز لمس محسوس کیا تھا۔ وہ مرد اس عورت کے صبر و استقامت سے ہار گیا تھا۔ یہ ہار اس عورت کے لیے قدرت کا انعام تھی۔ جس پر وہ عورت بہت حیران تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کو جمال نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ وہ ان کے دروازے پر دستک دے کر اجازت کا انتظار کرنے لگا۔

"آ جاؤ۔" باپ کی تلخ آواز اسے کافی ترش محسوس ہوئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ دھیرے سے چلتا ان کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"کل تم نے اپنے سسر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ تم بیوی کو طلاق دینے جا رہے تھے۔ ہوش میں تھے تم۔ تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری ساری جائیداد میں وہ تمہاری حصہ دار ہے۔ اس کے جانے کے بعد کیا تم لوگوں سے بھیک مانگتے پھرتے اور پھر عزت بھی کوئی شے ہے۔ ذرا بھی شرم نہیں تم میں۔ ذرا بھی غیرت نہیں آتی تمہیں۔" جمال اعوان اس وقت شدید غصے کی کیفیت میں گھرے اسے ———— گھور رہے تھے۔

"اب ٹھیک ٹھیک بتا دو آگے کیا ارادہ ہے تمہارا۔" وہ جو انہیں بڑے غور سے لیکن لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سن رہا تھا۔ دھیرے سے اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اپنا ارادہ میں آپ کی بہو کو بتا چکا ہوں۔ اس سے پوچھ لیں۔ اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے۔ پھر بات کریں گے۔" وہ مڑ کر جانے لگا۔ جب وہ تیز آواز میں چلاتے اس کے سامنے آ گئے۔

"اکڑ دیکھو میرے نام پر اتنا اکڑ رہے ہو۔ تم ہو کیا۔ کیا ارادہ بنائے بیٹھے ہو۔ تمہارے ارادے کو تمہارے ساتھ ہی ملیامیٹ نہ کر دوں۔ کیا کہا ہے تم نے اسے۔ اب جو ذرا سی عزت رہ گئی ہے وہ بھی نیلام کرو گے۔" شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ جوتے

کی نوک سے کارپٹ کو کھرچتا سر جھکائے کھڑا تھا۔ باپ کے اشتعال دلانے والے انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان پھیل گئی تھی۔

"میں اسے نہیں چھوڑ رہا۔ میں اسے اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لیے اس شہر سے باہر لے جا رہا ہوں۔ میں اسے مار ڈالوں گا یا اسے کہیں چھوڑ دوں گا جیسے تفکرات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بیوی ہے میری۔ اپنی عزت کا پاس مجھے ہو یا نہیں پر بیوی کی عزت کا پاس بہرحال ہمیشہ مجھے ——— رہا ہے بے غیرت ہوں پر اتنا ہرگز نہیں۔ اسے کچھ نہیں ہوگا اور رہی آپ کی عزت کی بات تو میں آپ کی بچی کھچی عزت کو ہرگز نیلام نہیں کروں گا۔" اس کا لہجہ تلخی اور طنز سے بھرپور تھا یہ کہہ کر وہ رکا نہیں چلا گیا جبکہ جمال اعوان حیرت کے سمندر میں ڈوبے اس نئی خبر پر حیراں و مبہوت تھے۔ اگر یہ سب جوان کا بیٹا کہہ گیا تھا درست تھا تو یہ کرشمہ ہوا کیسے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک مسرت انگیز ٹھنڈی میٹھی پر سکون لہر انہوں نے اپنے تن بدن میں محسوس کی تھی۔ ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر وہ مطمئن سے وہیں صوفے پر بیٹھے رہے۔

وہ سیدھا اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ بیڈ پر دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ آہٹ پر چونک کر وہ دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ اسے دیکھ کر یکدم سے اٹھ بیٹھی۔

"کل کے لیے بیگ تیار کرو۔ کپڑے موٹے لینا۔ ان دنوں وہاں سردی ہوگی۔ میرا بیگ بھی تیار کر دینا۔ کل صبح سویرے ہمیں نکلنا ہے۔" وہ کھڑے کھڑے کہہ کر چلا گیا تھا۔ کل رات کو ہی اس نے اسے اپنے جانے کا بتایا تھا۔ اپنا بیگ تیار کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی۔

وہ الماری کے پاس پشت کیے کھڑا تھا۔

"وہ بیگ۔" قریب جانے پر وہ اس کے عقب میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز پر وہ بے ساختہ مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے جگہ دینے کو کچھ پیچھے ہوا۔ اس کے ہاتھ میں روپے تھے جن کو وہ گن رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیگ نکال کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا تھا۔ اسے کپڑوں کے بارے میں کنفیوژن ہو رہی تھی کچھ سوچ کر وہ پوچھ بیٹھی تھی۔ "کونسے کپڑے رکھنے ہیں؟" روپے گنتے گنتے بنا دیکھے اس نے جواب دیا تھا۔

"جو رکھنا چاہو۔" اس نے اپنی پسند کے کپڑے نکال دیے تھے۔ بیڈ پر بیگ رکھ کر اس نے ترتیب سے موزے گرم سویٹر وغیرہ سب چیزیں ایک ایک کر کے رکھ دی تھیں۔ ترتیب درست کرنے کے دوران وہ بھی اس کے پاس آ کر بیگ کھسکا کر اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے بیڈ سے پاؤں لٹکائے لیٹ گیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ کام نہیں کر پا رہی تھی۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ایک دو بار اس نے جائزہ لینے کے لیے آنکھیں کھول کر بیگ پر نگاہ بھی ڈالی تھی اور پھر کچھ پل بعد نگاہیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔

"باقی کچھ رہتا تو نہیں۔" اس کی آواز پر اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔

"نہیں، کل صبح کس وقت جانا ہے؟" جواب دیتے ہی اس نے فوراً سوال کیا۔ ساتھ ہی اس نے بیگ نیچے کارپٹ پر رکھ دیا تھا۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کل چھ بجے۔" وہ سر ہلا کر جانے لگی۔ اس نے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ وہ اس کے قریب آئی تو وہ بولا تھا۔

"بیٹھو یہاں۔" وہ چپ چاپ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"میرے ساتھ رہنے پر تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جو کہنے والا تھا اسے عقل آ گئی۔ جس بات سے میں ڈرتا تھا وہ تو ہو گئی۔ جس بات سے تم ڈرتی ہو وہ اب کبھی نہیں ہوگی۔ اس لیے تم اس کمرے میں آنے سے جھجکنا بند کر دو۔" وہ دھیرے دھیرے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ جانے کیوں اس پل اس کی آنکھوں میں آنسو

آ گئے تھے۔ جو اس کے گالوں کو بھگو گئے۔

"تم اگر رو رو کر۔۔۔ آنسوؤں کے سمندر بھی بہا دو تو تمہارا وہ درد کم نہ ہو سکے گا جو میں نے تمہیں دیا۔ تم ایک ادھ کھلی کلی تھیں جسے میں نے مسل کر رکھ دیا۔ صرف تمہیں نہیں ان کو بھی جواب صرف ایک یاد ہیں۔" اس کی آنکھیں بھی گیلی ہونے لگی تھیں۔

"خطا ایک بار خطا کہلاتی ہے۔ دوسری بار خطا کہلاتی ہے ہر بار نہیں۔ ہر بار کی خطا خطا نہیں ہوتی فرعونیت ہوتی ہے۔ خطا کی معافی ہو سکتی ہے فرعونیت کی نہیں۔ میری تو معافی بھی نہیں ہوگی اتنے گناہ کیے میں نے کس کس کا دل نہیں دکھایا میں نے۔ کس کس کو اذیت نہیں دی میں نے۔" وہ خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ "قیامت کے دن تم کہو گی نا کہ تم نے مجھے معاف کیا تھا۔ بولو کہو گی نا۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کندھے کو ہلاتے ہوئے اس نے رندھی آواز میں کہا تھا۔ اس پل اسے کوئی لفظ نہیں سوجھ رہا تھا۔ الفاظ بھک سے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔

"کہو تم نے مجھے معاف کیا؟" کل رات معافی طلب کرنے اور اس کے معاف کر دینے کے باوجود آج وہ پھر اس سے معافی کا خواستگار تھا۔ بنا جواب دیے وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر شدت سے رونے لگی۔ اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ کا حصار اس کے گرد باندھ دیا تھا اور بڑے والہانہ انداز سے اسے اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹی ٹاپ ان ہوٹل میں کمرہ بک کرا کر وہ دونوں کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ اتنے طویل سفر نے تھکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ دو گھنٹے کی اچھی نیند نے اس تکان کو دور کر دیا۔ اس وقت وہ دونوں بہت فریش موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔ باتھ لینے کے بعد وہ باہر لابی میں چلے آئے۔ گلاس وال کے پاس کھڑے وہ باہر کے موسم کا جائزہ لینے لگے۔ ہلکی ہلکی بارش کے قطرے گلاس وال پر جیسے ان کے باہر نکلنے کے ارادے کو مسدود کر چکے تھے۔ وہ کچھ دیر تک ساری وادی کا جائزہ لیتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ صوفے پر بیٹھ کر ایک انگلش میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ باہر کے مناظر میں کھوئی وہیں کھڑی تھی۔ بارش تیزی سے برس رہی تھی۔ پھر ژالہ باری ہونے لگی۔ جنگلی پھول جگہ جگہ بکھرے حسن و رعنائی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک حسین نظارہ تھا جو آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ وہ پہلی بار اتنی دور آئی تھی۔ بارش کے رکتے ہی وہ دونوں واک پر نکل آئے۔ گرم شال گرم ٹوپی پہنے وہ اس کے ہمراہ تھی۔ شام کے سائے اپنا پر پھیلا رہے تھے۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ پہاڑ کے دامن سے نکلی شفاف سڑک پر چلے آئے۔ راستے میں سڑک کے کنارے واقع درختوں پر انہیں جگہ جگہ مختلف ناموں کے پہلے حروف نظر آئے۔ وہ رک گئی۔ جانے کیوں اس پل اس علاقے کے اس درخت پر اپنا نام لکھنے کی خواہش دل میں جاگی تھی۔ وہ درخت کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ وہ جو اسے تکے جا رہا تھا۔ اس کی تقلید میں وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ وہ زمین پر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی ناکامی کی صورت میں اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرایا تھا۔ پھر اپنی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ خفت سے چابی تھام کر درخت کی کھال کو کھرچنے لگی۔ لیکن اسے مشکل ہو رہی تھی۔ کچھ لمحے تو وہ اسے یونہی دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہاتھ سے چابی لے کر اس نے اس کے نام کا پہلا حرف لکھ ڈالا۔ وہ ممنونیت سے دیکھتی خاموش کھڑی تھی۔ پھر وہ اپنے نام کا پہلا حرف لکھنے لگا۔

"چلیں۔" اس نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ پھر اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ آگے چل پڑا۔ نیچے اتر کر آبادی میں آتے ہی انہیں جا بجا چھوٹی چھوٹی شاپس نظر آئیں۔ وہاں انہوں نے کباب کھائے۔ وہاں سے واپسی رات کو ہوئی۔ ان کے آنے کے کچھ

دیر بعد ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ وہ ونڈو میں کھڑی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ جبکہ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ باہر سے آنے کے بعد اس پر کچھ اداسی طاری ہو گئی ہے۔ اسے اس کے چہرے سے بے پناہ بے چینی جھلکتی نظر آئی۔ لیکن وہ کچھ پوچھنے کی جسارت کر نہ پائی۔ اس پل بارش کے نظارے پر نظریں جمائے وہ اسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس چلا آیا۔ تیز برستی بارش پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر وہ اس کے قریب ہو کر اپنا چہرہ اس کے کندھے پر ٹکائے بارش کو بغور دیکھنے لگا تھا۔ پھر اچانک چونک پڑا تھا۔ وہ جو کچھ نروس سی تھی اس کے سرعت سے ہٹنے پر بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ اس کا چہرہ زردی مائل ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔

"ہوں۔" وہ کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا تھا۔ پھر کچھ سمجھ کر ہی یکدم سے بولا تھا۔

"کچھ نہیں پلیز یہاں آؤ۔ یہ کھڑکی بند کر دو۔" خود کھڑکی بند کر کے وہ اس کا ہاتھ تھام کر ٹی وی بند کرتے ہوئے کہنے لگا تھا۔ "ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں بھوک لگ رہی ہے۔" اس کے عجیب و غریب رویے پر حیران ہوتی وہ اس کے ہمراہ ڈائننگ ہال میں چلی آئی۔

خریداری کرنے کے بعد وہ ایک مارکیٹ کے پاس سے گزر رہے تھے جب شوکیس میں آویزاں ایک خوب صورت مردانہ شال نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس کی توجہ اس جانب مبذول کروا کر وہ اس سے خریدنے کا کہنے لگی۔ وہ دونوں اندر دکان میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک کم عمر لڑکا بیٹھا تھا۔ "یہ شال نکالو۔" اس کی بات پر اس نے شال نکال کر ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس نے شال کو انگلیوں سے چھو کر اس کی ملائمت کا اندازہ لگایا۔

"اچھی ہے؟" اس نے اس کی رائے مانگی۔

"ہاں۔" وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"کیا بات ہے؟" وہ خود ہی مخاطب ہوئی تھی۔

"جی صاحب نماز کے لیے گئے ہیں ابھی آ جائیں گے آپ تھوڑی دیر بیٹھ جائیں۔" لڑکا مودبانہ انداز میں مخاطب تھا۔ وہ دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان کے اندر آتے ہی اس نے اس کا جائزہ لیا۔ اندر آنے والے نے اسے بغور دیکھا پھر کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے گہری نظریں اس پر جمائے بولا۔

"جی کیا چاہیے۔" اس نے نوٹ کیا تھا۔ وہ لڑکا اسے پرسوچ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ پل بعد اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔ اس کی آنکھوں میں در آئی شناسائی کی لہر سے قطع نظر وہ پاس کھڑی بیوی سے اس چادر پر تبادلہ خیال کرنے لگا۔ نوجوان کی نظریں کبھی اس پر جمتیں کبھی پاس کھڑی لڑکی پر۔ چادر پر بارگیننگ کر کے اس نے رقم تھما دی تھی۔

"صاحب پہچانا مجھے؟" اس کے سوال پر وہ کچھ متعجب سا کھڑا اسے بغور دیکھنے لگا۔

"میں وہی ہوں جس سے ایک بار آپ نے بان کے جوتے خریدے تھے۔" اس نے کچھ یاد دلاتے ہوئے بڑے مسرت انگیز انداز میں کہا تھا۔

"پھر آپ سے کافی گپ شپ ہوئی تھی۔ پھر آپ کو آپ کی بیوی نے کال کی تھی اور آپ نے انہیں بتایا تھا کہ آپ میری دکان پر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے یاد دلانے کو ایک لمبی وضاحت دی تھی۔ اتنی طویل وضاحت پر اب اگر اسے یاد نہ آتا تو کب آتا۔

"کیسے ہیں آپ؟" اب کی بار اس نے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے جبکہ پاس کھڑی لڑکی کی رنگت بدل گئی تھی۔ ایک نظر پاس کھڑی رابیلہ پر ڈال کر پھر سے سوال کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے تو بان کی دکان تھی آپ کی اب کپڑے کی۔"

"ہاں صاحب اس تجارت میں فائدہ ہوا تو پھر کپڑے کی یہ دکان کھول لی۔ بس ماشاء اللہ چل نکلی۔"

وہ خوشی خوشی بتا رہا تھا۔

"صاحب آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔" اس نے ملازم لڑکے کو آواز دے کر کہا تھا۔

"نہیں ابھی نہیں کچھ شاپنگ رہتی ہے۔ جانے سے پہلے میں تم سے ملنے ضرور آؤں گا پھر چائے بھی پیوں گا۔" اس نے اسے محبت آمیز انداز سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اس کی شاپ سے نکل آئے۔ ان کے بیچ ہونے والی گفتگو نے اسے اداس کر دیا تھا۔ یعنی یہیں کہیں ان کی محبت کی داستان چھپی تھی یہیں کہیں ان کی محبت پروان چڑھی تھی۔

"کیا ہوا تھا یہاں؟" دل میں درد سا اٹھا۔ یہ سوال درد ناک احساس سے دوچار کر گیا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے گاڑی تک آئی۔ عثمان کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ خاموشی سے گاڑی کا لاک کھول کر اس نے سامان پچھلی سیٹوں پر ڈال دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ کچھ لمحے خاموش رہا۔ ان کے بیچ بوجھل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جسے اس کی آواز نے توڑا۔

"یہاں آ کر جو میں بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں تم اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی ہو۔" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"میرا تعلق میری یادیں بس اب تم تک محدود ہوں گی۔ میں سب بھلا دینا چاہتا ہوں۔ جو ہوا وہ میری قسمت میں نہیں تھا۔ قسمت نے ہم دونوں کا ملاپ لکھا ہے۔" وہ رکا اور پھر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بوجھل سی پرنم لگی تھیں۔

"میری قسمت میں تمہارا عشق لکھا ہے تمہارا عشق میری محبت سے بڑھ کر ہے۔ تم نے جو عشق کیا وہ انسان کو بنا دیا کرتا ہے۔ تمہارا عشق عشق ہے اور جو میں نے کیا وہ دنیاداری۔ حصول جسم، طلب جسم۔ وہ عشق نہیں تھا۔ وہ ایک من پسند طلب تھی۔ تم میری محبت سے بالکل نہیں گھبرانا کیونکہ میرا عشق میری محبت تمہارے عشق کی خاک تک کو چھونے کے قابل نہیں۔ تم وادی عشق ہو اور اس وادی عشق میں اترنے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہے۔" گاڑی فراٹے سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ وہاں مہیب سناٹا پھیل گیا۔

"اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں برباد کر کے میں اس کا الزام ماں باپ کے سر ڈال گیا۔ مجھے نہیں معلوم غلطی کس کی تھی؟ میری یا میرے والدین کی میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن جو میرے ساتھ ہوا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ ہمیشہ ایک بڑی زیادتی ظلم تصور کیا۔ پہلی محبت میں ناکامی نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رونا اس بات کا تھا کہ اس لڑکی کو صرف اور صرف غربت کے باعث مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ اس احساس نے میرے دل میں باپ کے خلاف شدید عناد پیدا کر دیا۔ دوسری محبت کا تو جنازہ نکلا اور پھر میری حالت ابتر ہو گئی۔ جو میرے ساتھ ہوا اس کا انتقام اپنے وجود سے لینا شروع کر دیا۔ لیکن یہ ایک غلط حرکت تھی۔ اس سے کسی کو فرق پڑتا یا نہیں پر مجھے ضرور پڑا یہ اب میں نے جانا۔ موت سے مجھے شروع سے ہی ڈر لگتا تھا اس لیے میں کبھی بھی خودکشی کی ہمت خود میں نہیں پا سکا۔ خود کو ختم کرنے کا حل میں نے نشے کی صورت نکالا۔ ہاں نشہ موت ہی تو ہوتا ہے۔ اپنے غم کو بھلا دینے کے لیے نشہ مجھے کسی نعمت سے کم نہیں لگا۔ جب کبھی مجھ پر ڈپریشن کا شدید دورہ پڑتا میں نشہ کر کے سکون محسوس کرتا تھا۔ پھر سب کچھ تبدیل ہونے کو ایک لڑکی آئی۔ وہ لڑکی تھی یا ہوا جو سب کچھ مسمار کر کے اپنا نشان ثبت کر گئی۔ وہ میری بیوی بن کر آئی۔ بیوی ان دنوں اس لفظ کی خوب صورتی اس کی چاشنی سے مجھے اتنی ہی نفرت تھی اتنا ہی بے خبر تھا میں جتنا کہ اپنے وجود سے وہ ایک نیک کردار لڑکی تھی۔ نیک اس لیے کہ میرے جیسے جانور کے ساتھ رہ کر سب کچھ سہتی رہی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں بے پناہ حیا تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھوں میں گھلی حیا سے شدید

خوف محسوس ہوتا۔ وہ حیا اپنے ساتھ بے پناہ طاقت رکھتی تھی تعظیم کرنے کی طاقت۔ عزت دینے کی طاقت وہ ایک شریف لڑکی تھی اس کے ماں باپ بھی فطرتاً" شریف لوگ تھے۔ میں نشہ کرتا رہا۔ نشے کی حالت میں اس لڑکی کو بکتا جھکتا۔ لیکن اس کے باوجود بھی میری خدمت میں وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت بڑھتی دیکھی۔ مجھے ان دنوں محبت سے شدید نفرت ہونے لگی۔ محبت سے ہی الرجک ہو گیا تھا میں۔ اس محبت نے ہی مجھے غم میں مبتلا کر دیا تھا۔ صرف محبت کے باعث 'صرف محبت' صرف اس ایک جذبے نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ نفرت تھی مجھے محبت سے۔ دنیا سے الگ کر دینے والی محبت۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کیوں میں اسے ٹارچر کرنے لگا تھا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے لیکن وہ کسی صورت جانے پر آمادہ نہ تھی۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی جو وہ چاہتی تھی وہ میں نہیں چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا۔ وہ تب بھی مجھے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ میرے ٹارچر کرنے میں شدت آتی گئی اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں اسے طلاق دینے لگا اور اس وقت جو ہوا وہ میرے لیے بہت شاکنگ تھا۔ بہت حیران کن۔ اپنے باپ کی بات رد کر کے وہ میرے ساتھ ایک بد کردار ایک گناہ گار کے ساتھ اپنی ساری زندگی بتانا چاہتی تھی ۔ بنا کسی امید کے بنا کسی توقع کے۔ صرف میری محبت میرے عشق میں۔ اس لڑکی کو مجھ سے اتنا عشق تھا کہ وہ صرف میرے نام سے منسلک رہنے کے لیے اپنی جوانی اپنا مستقبل سب داؤ پر لگانے کا تہیہ کر بیٹھی تھی وہ رو رو کر فریاد کر رہی تھی۔ اس وقت میں نشے میں نہیں تھا۔ یہ اس لڑکی کی خوش قسمتی تھی کہ میں اس وقت نشے میں نہیں تھا۔ اس کی فریاد اس کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کیونکہ میں حیرت زدہ تھا۔ وہ میری محبت میں اپنے باپ تک کو چھوڑ رہی تھی۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس لڑکی کو میرے وجود کی طلب نہیں تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی بنا کسی طلب کے۔ یہ کیسی محبت تھی کہ جس میں وجود کو وہ اہمیت ہی نہیں دے رہی تھی۔ جبکہ میں تو اپنی محبت میں وجود کے حصول کے لیے ہی تو لڑتا رہا تھا خود کو برباد کرتا رہا تھا۔ یعنی اس لڑکی کی محبت افضل تھی۔ اس محبت سے جو میں پچھلے کچھ سالوں سے سوگ کے طور پر الاپ رہا تھا۔ اوروں کو الزام دے کر خود احساس گناہ سے بری الذمہ ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کی فریاد پر دل پسیج گیا تھا تبھی میں نے اسے روکا۔

اس شام میں باہر واک پر گیا۔ پہلے میں اپنے اوپر ہونے والے مظالم پر سوچتا اور کڑھتا رہتا۔ جبکہ اس شام میں اس لڑکی پر ہونے والے مظالم کو سوچ رہا تھا۔ یعنی اس شام پہلی بار میں نے تمکین کو سوچنے کے بجائے اس لڑکی کو سوچا۔

پھر مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی کتنا گھٹیا تھا میں کہ دنیا کے ذرا سے مصائب سے نجات کے لیے کتنی بری راہ۔۔ کا انتخاب کیا تھا۔ اور وہ لڑکی کتنے صبر سے کتنے سکون سے آنے والے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اس پل اس کے صبر سے خوف محسوس ہوا۔ مجھے لگا تھا کہ اس کا صبر میرے وجود کو نیست و نابود کر دے گا۔ پہلی بار مجھے شدید خوف محسوس ہوا۔ اس سب سے جو میں کرتا آیا تھا۔ جس میں سر فہرست والدین کی نافرمانی تھی۔ اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے یہ کیا کر بیٹھا تھا میں اس لڑکی کے ساتھ میرے وجود کو کوئی اہمیت نہ دے کر اس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ پھر اسی رات میں نے اس لڑکی کو اپنی زندگی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس شام میں نے حقیقتاً اسے اپنی بیوی مان لیا تھا۔ اس رات میں نے اس سے معافی مانگ لی پھر اسی رات میں نے کسی صحت افزا مقام پر جانے کا پلان بنایا میں چاہتا تھا کہ میں کچھ عرصہ باہر گزار کر اس

ماحول سے اس کیفیت سے اور پھر اس مسلسل نشے سے دور رہوں۔ میں غم کو بھلانے کے لیے نشہ کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ غم اس وقت ہوتا ہے جب انسان اسے بھلانا چاہے۔ اس لڑکی کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات کر کے میں دھیرے دھیرے خود پر بیتنے والے تمام واقعات کو بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ زندگی واقعی انسان سے وہ کچھ کروا لیتی ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کرتا۔ میں نے بھی یہ تصور کبھی نہیں کیا تھا۔"

☆ ☆ ☆

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ گرم شال اوڑھے دونوں ہاتھ اپنے گرد باندھے وہ ارد گرد پر بھی نظریں دوڑا رہی تھی۔

"بارش تیز ہو رہی ہے۔ جانا نہیں ہے۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔ وہ بنا جواب دیے چلا جا رہا تھا۔ کچھ پل کو وہ خاموش رہی۔ کچھ ساعت بعد وہ پھر سے کہنے لگی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔" اب کی بار وہ اسے دیکھنے لگا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ سامنے دیکھنے لگا تھا۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر اس نے ٹرن لیا۔ اپنے پیچھے اس کے قدموں کی آواز نہ پا کر اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ دائیں جانب ذیلی سڑک پر تیز تیز قدم رکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ زیرِ لب مسکراتا رہا۔ وہ ہمیشہ فکرمند رہا کرتی تھی ذرا سی بات پر اس کی یہ خوبی اسے بڑی گراں گزرتی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے اس پر نظر نہیں ڈالی سیدھی چلی جا رہی تھی۔

"ناراض ہو۔" وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔ اس نے کلائی تھام کر اس کا چہرہ اپنی جانب کیا۔

"آئسکریم کھاؤ گی؟" اس کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

خواتین ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کی ایک خوبصورت پیشکش

نامور مصنفہ رضیہ جمیل

کا "ساگر دریا بادل بوند"

کے بعد مشہور و معروف ناول

اک گھروندہ برف کا

اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

☆ خوبصورت سرورق

☆ مضبوط جلد

☆ آفسٹ پیپر

قیمت صرف =/300 روپے

کتاب منگوانے کے لیے آج ہی =/330 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔

ملنے کا پتا

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

"پلیز اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ لجاجت آمیز انداز میں کہہ گئی۔ انہیں واک پر نکلے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ساس نے اس سے آج بات کرنی تھی بات ضروری تھی۔ ان کا فون آنے والا تھا بارش بھی تیز ہو رہی تھی۔ ان کے قدموں کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ گھر تک آتے آتے وہ اچھے خاصے بھیگ گئے۔

دونوں نے کپڑے چینج کر لیے۔ وہ سونے کے لیے لیٹنے لگی تو اس نے چائے کی فرمائش کر دی۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اتنے لمبے واک نے اسے تھکا ڈالا تھا اوپر سے غضب کی سردی نے سارے بدن کو سن کر دیا تھا۔ مری میں ان دنوں شدید سردی تھی۔ وہ اپنے گھر میں تھے۔ یہ گھر جمال اعوان نے خریدا تھا۔ وہ لوگ مری میں ہونے والی برف باری دیکھنے آئے تھے۔ شمالی علاقہ جات کی سیر کے بعد وہ بجائے گھر جانے کے یہیں چلے آئے۔ وہ چائے بنا رہی تھی جب وہ کچن میں آیا۔ یہ گھر جدید طرز پر بنا ہر سہولت سے مزین تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ چائے کپ میں ڈال کر وہ جونہی پلٹی تو اسے دیکھ کر فوراً بولی۔

"میں لا رہی تھی۔" اس نے صفائی دینی چاہی۔ اس کا موڈ کچھ آف تھا جس کا اندازہ شاید اسے ہو گیا تھا۔ تبھی یہاں چلا آیا۔ اس کی طبیعت کچھ عرصے سے گری گری سی رہتی تھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق وہ امید سے تھی۔ اس کے ہزار بار کہنے کے باوجود وہ گھر واپس جانے کا نام نہ لے رہا تھا۔ وہ یہ خوشی سب کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔

"اتنی اداس کیوں ہو؟" کپ اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے کاؤنٹر پر رکھ دیا اور خود گلاس لے کر کولر سے پانی پینے لگا۔ وہ چپ سادھے بیٹھی تھی۔

"گھر جانا چاہتی ہو؟" پانی پی کر گلاس شیلف پر رکھ کر وہ بولا۔ وہ اب بھی خاموش رہی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پاس چلا آیا۔

"جب اوروں کے پاس تھیں تم تو میرے پاس آنا چاہتی تھیں۔ آج میرے پاس ہو تو باقی سب کے پاس جانا چاہتی ہو۔ کیا تنگ آ گئی ہو میرا وجود دیکھ دیکھ کر۔"

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ براہ راست سوال کر رہا تھا۔ اس کی نظریں زمین سے اٹھتی اس کی شرٹ کے بٹنوں پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔ اس کی شرٹ کے پہلے دو بٹن کھلے تھے۔ اس کے سینے پر ایک گہرا براؤن تل نظر آیا تھا۔ وہ اس تل کی خوب صورتی میں کھوئی کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اس تل کی خوب صورتی کو تکتی رہنے والی اسے سراہنے والی کوئی اور بھی رہی ہوگی۔ اس کو سوچتے ہی حسد کا مادہ کیوں ابلنے لگا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ کیوں فضول سوچتی تھی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ جانے اس پل اسے کیا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر شرٹ کے بٹن کو بند کرنے لگی۔ وہ متعجب سا اس کی اس حرکت پر غور کرنے لگا۔ بٹن بند کرنے کے بعد وہ پیچھے ہو کر کاؤنٹر کی سطح کو ناخن سے کھرچنے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کسی بات کے ہونے کا غمازی کر رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو مزید پڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کل صبح ہم گھر جا رہے ہیں۔" اس کی آواز پر وہ یونہی سر جھکائے رہی۔ ایک گہری سانس بھر کر اس کے قریب ہو کر وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اس کے گرد بازوؤں کا حصار باندھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

"میں تمہارا ہوں اس بات کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ بہت ملائم تھا اور ہونٹوں پر دھیمی مسکان تھی۔

"مجھ سے میری طرح ہی عشق کرنا پڑے گا۔" بنا مڑے روتے ہوئے اس نے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ باہر گرج چمک جاری تھی۔ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلانے لگا تھا۔ وہ بے تحاشا رونے لگی تھی۔ اسے چپ کراتے کراتے وہ مسکرانے اور اسے تنگ کرنے لگا۔ روتے روتے بالآخر وہ ہنس پڑی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر اس نے اپنا کپ اٹھا لیا۔ چائے کا سپ لے کر اس نے کپ اس کے لبوں سے لگا دیا۔ اس لڑکی کا وجود عشق تھا اور اس مرد کو عشق سے ہمیشہ عشق رہا تھا۔

وہ باہر لان میں آیا۔ موسم نے مستی کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ وہ ایک لمبی ڈرائیو کے خیال سے گاڑی لے کر ڈرائیو پر نکل گیا۔

وہ پکوڑے تل کر پلیٹ میں ڈالے ساس کو پکڑا چکی تھی کپ اور پکوڑوں کی ڈش لیے باہر لان میں آئی تھی۔ ملازمہ سے پتہ چلا کہ صاحب باہر گئے ہیں۔ وہ خود ہی چائے سے شغل کرنے لگی۔ چائے پی کر وہ فارغ بیٹھی اسی کو سوچ رہی تھی۔ گیٹ پر نظر گئی تو نظریں ساکت رہ گئیں اپنے باپ کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے وہ اداس ہو گئی تھی۔ وہ کیوں آئے تھے۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس گئی تھی۔ سلام کرکے وہ ان کے ساتھ باہر لان میں ہی بیٹھ گئی۔ وہ فکر مند اور مضطرب لگ رہے تھے وہ خود کو لاپرواہ بے نیاز ظاہر کرنے لگی۔ وہ پریشان تھے اسے اندازہ تھا۔

"تم نے اتنی بڑی بات چھپائی کیوں؟" بات کا آغاز بڑی سنجیدگی سے کیا گیا۔

یہ مذاق کی بات نہیں تھی کہ دو دن دو لمحوں میں ٹل جاتی" وہ اسے ملامت کرتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"اتنا بڑا دھوکہ کیا گیا ہمارے ساتھ۔" وہ بہت زخم خوردہ لگ رہے تھے۔ وہ خود بھی زخم خوردہ تھی۔ اس لیے وہ انہیں خالی خالی نظروں سے تک رہی تھی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اگر اب بھی وہ نہیں سدھر رہا تو یہ غلط بات ہے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولے۔ پھر سر اٹھا کر اس سے کہنے لگے۔

"میں تمہارے سسر سے بات کروں گا۔ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی ہو گا۔" اس کے سسر کے آنے پر انہوں نے ان سے تفصیلاً بات کی تھی۔

"اس سے کہو کہ انسان بن جائے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اپنے رویے کو درست نہیں کر سکتا تو مجبوراً" مجھے اپنی بچی کے لیے سنجیدگی سے کچھ سوچنا پڑے گا۔ اس میں جتنی بے عزتی میری ہو گی اس سے دگنی آپ کی ہو گی۔ آج دو چار لوگوں کو آپ کے بیٹے کے بارے میں خبر ہو گی کل کو سو بندے اس کے کرتوت سے آگاہ ہوں گے بہتر ہے کہ یہ مسئلہ گھر کے اندر حل ہو یہ کس طرح سے حل ہو گا یہ مسئلہ آپ کا ہے۔ مجھے اپنی بچی کا اس طرح بیواؤں کی طرح رہنا ہرگز پسند نہیں ہے۔" ان کا ردعمل کافی سخت تھا۔ وہ جمال اعوان کی صفائیاں وضاحتیں کسی خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہ کافی دلگیر دکھائی دے رہے تھے۔ بات سلجھنے کی بجائے خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ماں باپ عزت دار لوگ تھے۔ وہ اسے یوں گھر نہیں بٹھا سکتے تھے وہ چاہتے تھے کہ بات بن جائے۔

وہ ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر بھی ہنوز اسی انداز میں لیٹا ٹی وی دیکھتا رہا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" اس نے کھڑے کھڑے کہا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ خشک سی آواز میں بولا۔

"بولو۔" اس نے اسے بیٹھنے کو نہیں کہا وہ کچھ پل اس کی طرف سے انتظار کرتی رہی تھی پھر خود ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی۔" وہ ٹی وی آف کر چکا تھا۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"صرف اس گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھی آپ سے کچھ نہیں چاہوں گی۔ صرف مجھے اس گھر میں سکون سے رہنے دیں میں آپ کا احسان زندگی بھر....."

"میرے ہوتے ہوئے تمہیں سکون نہیں ملے گا۔" اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے جانے کے بعد ہی تمہیں سکون مل پائے گا۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

"میری شادی ہوئی ہے یہاں۔ شادی ایک دو دن رہنے کی بات نہیں ہوتی یہ عمر بھر کا ساتھ....."

"بشرطیکہ دوسرا فریق چاہے" ایک بار پھر اس کی بات کو کاٹا گیا تھا۔